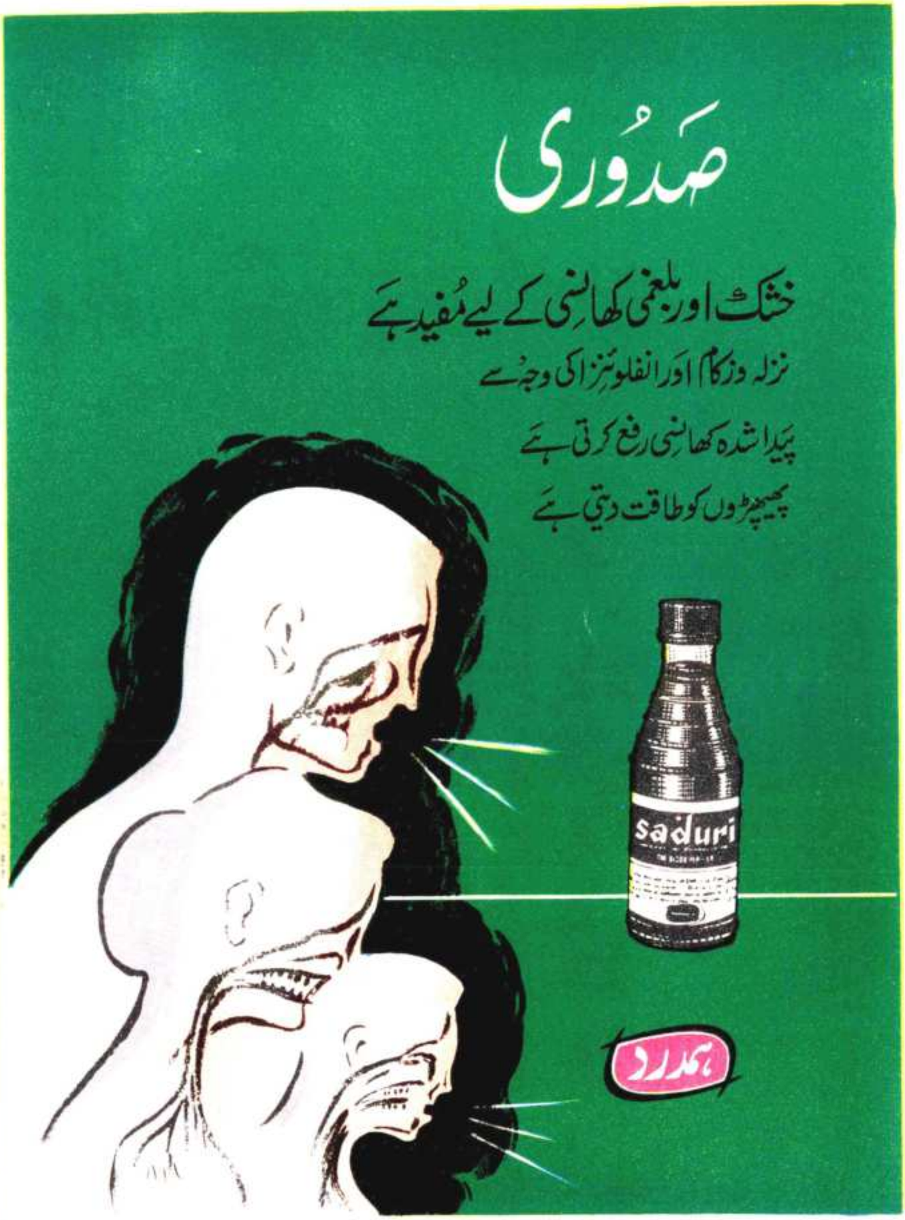

ہمدرد نونہال
SAMI.65


صدوری
خشک اور بلغمی کھانسی کے لیے مفید ہے
نزلہ وزکام اور انفلوئنزا کی وجہ سے
پیدا شدہ کھانسی رفع کرتی ہے
پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے
saduri
ہمدرد

اکتوبر ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۱۰ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

# ہمدرد نونہال

## جاگو، جگاؤ

محنت کی عادت بڑی اچھی چیز ہے، محنتی آدمی کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ محنت نہ کرنے سے سستی اور کاہلی کی عادت پڑجاتی ہے اور انسان کی ترقی رک جاتی ہے۔ محنت سے انسان کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ مشکل سے مشکل کام کو آسانی اور خوبی سے انجام دے لیتا ہے۔

حکیم محمد سعید



قیمت:— ایک رسالہ: ۷۵ پیسے — سالانہ: آٹھ روپے





# ننھا خرگوش

محشر بدایونی

دیکھو مجھے بچّو ذرا
بچّہ ہوں میں خرگوش کا
ہر دم اچھلتا کودتا
ہاں کان ہیں کتنے بڑے کیسے تنے کیسے کھڑے
یہ قد ہے کیسا گول سا
بالوں میں ریشم کی چمک آنکھوں میں شیشے کی دمک
سارا بدن نکھرا ہوا
کیا اُجلا اُجلا رنگ ہے کیا پیارا پیارا ڈھنگ ہے
ہے جسم گالا سا مرا
میں ہر گھڑی مسرور ہوں دنیا کے غم سے دور ہوں
رکھتا ہوں میں کنبہ بڑا
آنگن مرا میدان ہے گلّو بڑا شیطان ہے
پھرتا ہے پیچھے بھاگتا
دیکھو مجھے بچّو ذرا
بچّہ ہوں میں خرگوش کا
ہر دم اچھلتا کودتا





# میں کبھی نہیں بھولوں گا

چودھری عبدُالغفور ایم۔اے

میں کسی چھوٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک گول مٹول سا لڑکا تھا۔ بچّوں نے اس کے عجیب عجیب نام رکھے ہوئے تھے۔ کوئی اسے "شہزادہ مٹکا" کہتا تھا۔ کوئی "گھی کا کُپّا" دُور سے سڑک پر نظر آجاتا تھا تو بچّے ہانک لگاتے "چل میرے مٹکے"۔ کبھی کبھی تو وہ غصّے کے مارے بھِنّا نہیں "پھوں پھوں آ" جاتا تھا، یعنی ایک بپھرے ہوئے بھینسے کی طرح ناک سے پھوں پھوں کی آواز نکالتا تھا، لیکن جب آوازہ کسنے والے یار لوگ ہوتے تھے تو وہ سچ مچ ایسے چلنے لگتا تھا، جیسے کوئی شہزادہ مٹکا ہو۔ چلتا کیا تھا، یوں سمجھ لو سڑک پر کوئی گیند لڑھکتی پڑکتی جارہی ہو۔ جیسے وہ خود گول مٹول تھا، ویسی ہی اس کی زبان بھی گول مٹول تھی۔ اب تم خود جانتے ہو کہ ایک گول مول چیز کا ٹِکنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ ماسٹر صاحب گول مٹول کو الفاظ یاد کراتے تھے اور وہ الفاظ اس کی گول مول زبان سے پھسل پھسل جاتے تھے۔ بے چارہ لاکھ روکنے کی کوشش کرتا تھا، مگر الفاظ تھے کہ رُکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے سبق میں لفظ "بالکل" آگیا۔ جماعت میں اکثر بچّوں کی زبان پر یہ لفظ چڑھتا نہیں تھا۔ ماسٹر صاحب نے تھک ہار کر اس کی مشق کرانی شروع کی۔ وہ "بالکل" کا لفظ بلند آواز سے کہتے۔ تھے اور سب بچّے مِل کر مصرع کو اس طرح اٹھاتے تھے گویا کمرے کی چھت سر پہ اٹھا نہیں لیں گے، بلکہ اُڑا دیں گے۔ جب ماسٹر صاحب مشق کراتے

کراتے تھک گئے" تو کہنے لگے "کیوں بھئی، "بالکل آگیا"۔ اس پر شہزادے صاحب اس زور سے بولے گویا مٹکا پھٹ پڑا ہو اور کہنے لگے، "جی ہاں گُل بِل آگیا"۔

بس پھر کیا تھا، ماسٹر صاحب نے بائیں ہاتھ سے شہزادے میاں کی گردن دبوچی اور دائیں سے طمانچہ دے کر بولے، "بالکل آگیا"۔ شہزادے میاں نے اس کے جواب میں اپنا سر اس طرح ہلایا گویا کسی شعر کی داد دے رہے ہوں اور دھیمی آواز میں بولے "جی ہاں، کل بِل"۔ بس پھر کیا تھا، ایک طرف سے طمانچہ پڑتا تھا اور دوسری طرف سے جواب ملتا۔ اس طرح ماسٹر صاحب نے شہزادے مٹکے کو "بالکل" کا لفظ "گُل بِل" یاد کرا دیا تو بھئی آج مجھے کچھ ایسی باتیں سُنانی ہیں، جو مجھے بالکل یاد ہیں اور کچھ ایسی، جو مجھے شہزادے مٹکے کی طرح "کل بل" یاد کرائی گئی ہیں۔ آج ہم تمھیں صرف "بالکل" والی باتیں سُنائیں گے اور "گُل بل" والی باتیں کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

میرا بچپن کا شہر باغوں کا شہر تھا۔ اسکول کا راستہ بھی باغوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ خود اسکول کے گرد بہت بڑا باغ تھا۔ اس میں گھنیری چھاؤں کے درخت تھے، ان کے نیچے دن کے وقت بھی اندھیرا سا رہتا تھا۔ یہ باغ میرے کھیل کے میدان اور ان کے درخت میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ ان کی تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ ان باغوں میں ہم ہر قسم کے کھیل کھیلتے تھے، لیکن مجھے ان سب کھیلوں میں سے ایک ڈنڈے کا کھیل پسند تھا۔ یہ کھیل ایسے درخت پر کھیلا جاتا تھا، جس کی موٹی موٹی شاخیں زمین کے قریب پھیلی ہوئی ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی درخت پسند ہیں۔ وہ بھی کیا درخت ہوئے کہ سیدھا آسمان کا رُخ کر رہے ہیں، کبھی زمین کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو تو ایسے درخت پسند ہوتے تھے، جو ہماری خاطر زمین پر بچھے جاتے ہوں، گویا کہہ رہے ہوں، آئیے آئیے سر آنکھوں پر آئیے، ہماری شاخوں پر جھولیے۔ ہماری ٹہنیوں سے لپٹیے۔

ڈنڈے کے کھیل میں ایک بچے کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا تھا۔ وہ اسے ٹانگ کے نیچے سے پھرا کر دور پھینک دیتا تھا۔ باری

دینے والا لڑکا ڈنڈا لینے جاتا تو دوسرے لڑکے درخت پر چڑھ جاتے۔ باری دینے والا بچّہ ڈنڈے کو نیچے رکھ دیتا اور درخت پر چڑھ کر کسی بچے کو چھُونے کی کوشش کرتا۔ دوسرے بچے یہ کوشش کرتے کہ اس کے اترنے سے پہلے نیچے آجائیں اور ڈنڈے کو چُوم لیں۔ اس کھیل میں ایک دفعہ میرا بازو بھی ٹوٹا تھا، اِسی لیے میں اس کھیل کو کبھی نہیں بھولوں گا۔

معلوم ہوتا ہے یہ کھیل سب سے پہلے لنگوروں نے ایجاد کیا تھا اور بچّوں نے اسے لے تو لیا، لیکن اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ بھئی بات یہ ہے کہ اگر درخت پر بیٹھے بیٹھے لنگور کے ہاتھ پاؤں چھوٹ جائیں تو وہ ٹہنی کے گِرد اپنی دُم کو بَل دے لیتا ہے اور مزے سے جھولنے لگتا ہے۔ اگر میرے پاس بھی ایسا کوئی اوزار یا ہتھیار ہوتا تو میں بھی مزے سے جھُولنے لگتا، لیکن اس میں ایک خرابی ضرور تھی کہ پھر مجھے یہ واقعہ یاد نہ رہتا اور میں آپ کو بھول کر بھی نہ سُنا سکتا۔

مجھے اس وقت یہ تو یاد نہیں کہ میں نے عینک کب لگائی، البتہ اس وقت یہ خیال آرہا ہے کہ مجھے عینک بچپن سے ہی لگا لینی چاہیے تھی۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے ایک بیری کا درخت تھا۔ موسم آیا تو اس کی شاخیں بیروں سے لدگئیں۔ میری ان بیروں پر ایک عرصے سے نظر تھی، لیکن گھر والوں کی نظریں مجھ سے بھی زیادہ تیز تھیں، اس لیے ڈر کے مارے ادھر کا رُخ نہیں کرتا تھا۔ ایک دن شام کو دبے پاؤں چھت پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں پیلے پیلے بیر کندن کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بیری کوئی نئی نویلی دلہن ہے اور اس نے سنہری بُندوں کے گچھے کانوں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا سا گچھا تو روشنی میں سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ میری نگاہ کچھ ایسی کم زور تو نہیں تھی، مگر کہتے ہیں محبت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ مجھ پر اس وقت بیروں کا جنون سوار تھا۔ گچھے پر ہاتھ جو مارا تو سارے بدن میں آگ سی دوڑ گئی۔ معلوم ہوا، گچھا نہیں، بلکہ بھِڑوں کا چھتا ہے۔ اب آپ کو اس بات کا تو یقین آگیا ہوگا کہ میں اس واقعے کو عمر بھر نہیں بھُول سکتا۔ ان بھِڑوں میں سے بعض نے تو میرے

چہرے کی خبر لی اور بعض زیادہ تحقیقات کے لیے قمیص کے اندر گھس گئیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارا بھید کھلا اور بھرے گھر میں کھلا۔ رُسوائی ہوئی اور ہم نے اس رسوائی میں خود حصّہ لیا اور قمیص کے اندر کی بھڑوں نے ہمیں سارے صحن میں وہ ناچ نچایا کہ طبیعت صاف ہوگئی۔

درختوں کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے باسیوں سے بھی دل چسپی تھی، مگر ایک کم بخت توتے نے اس دل چسپی کو کم کر دیا۔ میری امّاں جان نے ایک توتا پالا۔ مجھے بھی اس سے دل چسپی تھی۔ دل چسپی کیا، یوں سمجھو کہ میں تو اس کا بن خریدا غلام تھا اور وہ مجھے اپنی توتا چشمی نظروں سے ایک دفعہ بھی نگاہ چُرا کر دیکھ لیتا تھا تو میرا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت سب لوگ آرام کر رہے تھے کہ میں نے تھوڑی سی کوزہ مصری الماری سے نکالی اور پنجرے کے پاس جا کر چپکے سے بولا "میاں مٹھو، مصری لو"۔ وہ کم بخت کچھ دیر تو اپنی ایک آنکھ مجھ پر جما کر دیکھتا رہا، اتنا خاموش اور بے پَروا، جیسے اسے مصری سے کوئی دل چسپی نہیں اور اس کے بعد جو جھپٹا تو میری انگلی میں ایسا ٹھکتا مارا کہ ساتھ ہی خون کی ٹُلّی چھوٹ گئی۔

خیر یہ تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں تھی، لیکن اس کم بخت کی ایک حرکت نے تو مجھے ایسا بدنام کیا کہ میں اسے عمر بھر نہیں بھولوں گا۔ ایک دن گلی میں ایک کتّا میرے پیچھے بھاگا۔ میری کتّوں سے رُوح فنا ہوتی تھی۔ میں نے گھر کا رُخ کیا۔ اندر گھسنے والا ہی تھا کہ اس نے میری ٹانگ کو دبوچ لیا۔ اس پر میں نے ایسی چیخ ماری کہ گھر بھر اکٹّھا ہو گیا۔ سب دلاسا دینے لگے۔ ایک ہمسائی والدہ سے کہنے لگی، "بی بی! کاکا ڈر گیا۔" بس پھر کیا تھا، جب کبھی کوئی شخص گھر میں آتا تو توتے میاں زور زور سے چیخنے لگتے، "بی بی کاکا ڈر گیا۔"

اس پر مہمان کو ہمارے فرار کا پورا قصّہ سُنایا جاتا اور ہمارے سامنے سُنایا جاتا۔

مجھ پر مارے شرم کے گھڑوں پانی پڑ جاتا، مگر اس کے پَروں پر ایک بوند بھی نظر نہ آتی تھی۔

تو بھئی میرا کہنا یہ ہے کہ توتا نہ پالنا اور اگر پالنا ہی ہے تو اس کے سامنے کتّے سے ڈر کر نہ بھاگنا۔

# دوست کا تحفہ

میرزا ادیب

تم میں سے کوئی بچّہ ایسا نہیں ہوگا، جس نے خواجہ نظام الدین اولیا کا نام نہ سنا ہو۔ خواجہ صاحب بہت بڑے بزرگ تھے۔ بہت نیک اور طبیعت کے بہت سادہ۔ دوست دشمن سب سے پیار کرتے تھے۔ دوستوں سے کون نیک سلوک نہیں کرتا، سب کرتے ہیں، مگر جو لوگ دوست نہ ہوں بلکہ دشمن ہوں اُن سے بھی اچھا سلوک کرنا اور اُن کی بھلائی کا خیال رکھنا بہت بڑی بات ہے اور خواجہ صاحب میں یہ خوبی تھی۔ اُن کے گھر کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا اور جو بھی وہاں جانا چاہتا آزادانہ جا سکتا تھا۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جس زمانے میں خواجہ نظام الدین اولیا زندہ تھے اور رات دن لوگوں کو فیض پہنچاتے رہتے تھے۔ دہلی میں دو شخص رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا احمد اور دوسرے کا حامد۔ احمد خواجہ صاحب کا مرید تھا اور جب بھی اُن کا نام لیتا تھا، بڑے ادب اور عزت کے ساتھ لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں حامد کو خواجہ صاحب سے کوئی عقیدت نہیں تھی، بلکہ وہ اُن کی بڑھتی ہوئی شہرت دیکھ کر کُڑھتا رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ خواجہ صاحب کو جو عزّت اور شہرت ملی ہے اس کے وہ حق دار نہیں ہیں۔ اور لوگ یوں ہی ان کا اتنا احترام کرتے ہیں۔

ایک دن احمد نے حامد کو گھر پر بلایا اور کہا، "دیکھ بھائی، یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم خواجہ نظام الدین اولیا جیسے بزرگوں اور درویشوں کی بُرائیاں کرتے رہتے ہو۔ اگر تم اُن کا احترام نہیں کر سکتے تو کم از کم اُن کی برائی تو نہ کرو۔ اس سے ہم لوگوں کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔"

حامد بولا، "مجھے خواجہ صاحب میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آئی۔ اُن کا احترام کروں تو کیا کروں!"

احمد نے کہا، "تم ایک بار خواجہ صاحب

سے مِل کر تو دیکھو! ان سے ملے بغیر کِس طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کیسے آدمی ہیں اور کیسے نہیں ہیں"!

حامد نے احمد کی بات مان لی اور بولا، "بہت اچھا میں ان کے پاس جاؤں گا، لیکن انہیں اطلاع نہیں دوں گا۔ چھپ کر اُن کا امتحان لوں گا"!

احمد نے کہا، "بہت اچھا! تم امتحان ہی لو، مگر جاکر دیکھو تو سہی ان کے پاس۔ تمھیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قِسم کے بزرگ ہیں اور اُن کے دل میں کتنی نیکی اور پاکیزگی ہے۔"

حامِد نے اپنے دوست سے وعدہ تو کرلیا کہ وہ خواجہ نظام الدین اولیا کے ہاں جائے گا اور اُن کا امتحان لے گا، مگر وہ حیران تھا کہ وہاں جاکر کرے گا کیا اور کس طرح معلوم کر سکے گا کہ وہ کیسے درویش ہیں۔ جس سے بھی وہ ملتا تھا، وہی ان کی بے حد تعریف کرتا تھا۔ کسی نے بھی اُن کی کوئی برائی نہیں کی تھی۔ اس حالت میں وہ کِسی سے کوئی مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔

پہلے دن وہ خواجہ صاحب کے مکان میں گیا اور لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لوگ نذرانے لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب یہ نذرانے فوراً لوگوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھتے تھے۔

حامد نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنے گھر آگیا اور گھر پہنچ کر سوچنے لگا کہ کل جب وہ خواجہ صاحب کے یہاں جائے گا تو وہاں جاکر کیا کرے گا۔ سوچتے سوچتے ایک تجویز اس کی سمجھ میں آگئی اُس نے پکّا اِرادہ کرلیا کہ اس تجویز پر وہ ضرور عمل کرے گا۔ اور جب یہ تجویز اُس نے پُوری طرح سوچ لی تو آرام سے سوگیا۔

دوسرے دن وہ اٹھا۔ سیدھا دریا کے کنارے گیا۔ وہاں جاکر اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اُس رُومال میں کچھ ریت باندھ لی۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ خواجہ صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہاں لوگ آرہے تھے، جارہے تھے، کوئی کھانا لے جارہا تھا، کوئی کپڑے، بہت سارے خالی ہاتھ تھے۔ ایک شخص ایسا بھی تھا، جس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری تھی۔ حامِد نے مٹھائی والے شخص کو دروازے

کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا۔ جب وہ آگے جانے لگا تو اس نے کیا یہ بچّو! کہ ریت کی وہ پوٹلی مٹھائی کی ٹوکری میں رکھ دی اور آپ چھپ کر دیکھنے لگا کہ اب ہوتا کیا ہے! وہ شخص مٹھائی کی ٹوکری اٹھا کر حضور نظام الدین اولیا کے پاس چلا گیا۔ ٹوکری اُس نے خواجہ صاحب کے سامنے رکھ دی، مگر جیسے ہی اس کی نظر اپنی ٹوکری پر پڑی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس میں ایک پوٹلی بھی پڑی ہے۔

یہ پوٹلی کہاں سے آئی۔ اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ میں تو صرف مٹھائی کی ٹوکری لے کر آیا تھا۔ کسی نے یہ پوٹلی میری ٹوکری میں ڈال دی ہے!"

اُس نے پوٹلی کو اٹھایا۔ اسے کھولا تو اُس میں ریت تھی۔

خواجہ صاحب اور باقی سب لوگ یہ چیز دیکھ رہے تھے۔ وہ شخص جو مٹھائی لے کر آیا تھا، دل میں سخت شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواجہ صاحب کیا کہیں گے۔ کیسا شخص ہے کہ مٹھائی کے ساتھ ریت کی پوٹلی بھی لے آیا ہے۔

وہ پوٹلی کو پرے پھینکنے ہی والا تھا کہ خواجہ صاحب نے اُسے روک دیا اور بولے، "بیٹا اسے مت پھینکو۔ یہ میرے ایک پیارے دوست نے تحفہ بھیجا ہے۔ پیارے دوست کا تحفہ بھی بہت پیارا ہوتا ہے، اسے میرے حوالے کر دو اور مٹھائی لوگوں میں بانٹ دو۔"

اس شخص نے ریت کی پوٹلی خواجہ صاحب کے ہاتھ میں رکھ دی۔ خواجہ صاحب نے اسے بڑی محبت کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

حامد نے جب یہ واقعہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں کتنے بڑے بزرگ اور نیک اِنسان کی بُرائی کیا کرتا تھا۔ یہ میری کتنی بڑی غلطی تھی۔ وہ فوراً آگے بڑھا اور خواجہ صاحب کے پاؤں پر گرنے لگا۔ خواجہ صاحب نے اُسے گرنے نہیں دیا۔ فوراً اسے اپنے سینے سے لگا لیا!

اس کے بعد وہ احمد کی طرح خواجہ نظام الدین اولیا رح کا عقیدت مند ہو گیا

★

# اخبار فروش لکھپتی

مسلم ضیائی

کوئی پچاس ساٹھ سال ہوئے، سردی زوروں پر تھی۔ شکاگو کے ایک تھیٹر سے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نکل رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر یا تو مسکراہٹ تھی یا وہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ جانتے ہو، کیوں؟ بات یہ ہے کہ ابھی ابھی انھوں نے مشہور شعبدہ باز اور جادوگر الگزینڈر ہرمان کے شعبدے دیکھے تھے۔

اسی وقت ایک اخبار بیچنے والا لڑکا سڑک کے کنارے کانپتا ہوا اخبار بیچتا کھڑا تھا۔ اس کے پاس نہ تو کوٹ تھا، سردی سے بچنے کے لیے اور نہ رُپیہ، تاکہ رات میں کسی جگہ آرام کرسکے۔

مجمع کے چلے جانے کے بعد اس نے وہی اخبار، جنھیں بیچنے کے لیے لایا تھا، اپنے بدن پر لپیٹ لیے اور تھیٹر کے پیچھے گلی میں ایک جگہ زمین پر ہی پڑ رہا، جو نیچے بھٹی ہونے کے سبب سے ذرا گرم تھی۔

اس وقت وہ بھوکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا، لیکن تھا بڑا ہمت والا۔ چناں چہ اسی حالت میں اس نے ارادہ کرلیا کہ میں بھی ایک روز الگزینڈر ہرمان کے مانند بہت بڑا جادوگر بنوں گا۔

اس لڑکے کا نام ہارورڈ تھرسٹن تھا، اس واقعے کے بیس سال بعد واقعی ایک مشہور جادوگر اور شعبدہ باز بن گیا۔

تماشا ختم ہونے کے بعد تھرسٹن تھیٹر سے نکل اس گلی میں پہنچا، جہاں اس نے تقریبًا بیس سال پہلے تھیٹر کے پیچھے کے ایک دروازے پر اپنے نام کے حروف کھودے تھے۔ جب سردی سے کانپتے ہوئے اس نے وہاں پناہ لی تھی۔ اسے

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے کھودے ہوئے حرف ابھی تک موجود تھے!

۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو جب اس کا انتقال ہوا تو ساری دنیا کے تمام جادوگر اور شعبدہ باز اسے "مہاگرو" مانتے تھے۔ عمر کے آخری چالیس برسوں میں اس نے ساری دنیا کے کئی چکر کیے اور اپنے کمالات سے ساری دنیا کو بار بار حیران کیا۔ تین کروڑ ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگوں نے اس کے کمالات دیکھے اور اس کا منافع چالیس لاکھ رُپے سے زیادہ تھا۔

اس کی سوانح عمری بڑی دل چسپ ہے۔ بچپن میں اس کے باپ نے گھوڑے تیز دوڑانے پر اسے چابک سے مارا جس پر تھرسٹن کو اتنا غصّہ آیا کہ وہ دروازے کو دھڑ سے بند کرتا ہوا چیختا چلّاتا سڑک پر نکلا اور اس کے بعد لاپتہ ہو گیا۔

پانچ سال تک ماں باپ کو تھرسٹن کی خبر نہ ملی اور انھیں اندیشہ ہوا کہ وہ مرگیا ہے۔ اس تمام عرصے میں تھرسٹن اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ کبھی بھیک مانگتا، کبھی چوری کرتا اور کبھی کھلیانوں یا ویران عمارتوں میں سو جاتا۔ اس عرصے میں وہ کئی بار پکڑا گیا۔ ریل سے نیچے ڈھکیل دیا گیا اور اس پر گولیاں بھی چلائی گئیں، لیکن اس نے گھر واپس جانے کا نام نہ لیا۔

کچھ عرصے بعد وہ ریس کے گھوڑوں کا سوار یا جوکی بن گیا اور جواری بھی، جس کی وجہ سے سترہ سال کی عمر میں اسے بے پیسہ اور بے سہارا نیویارک کی گلیوں میں مارا مارا پھرنا پڑا۔

ایک روز ایک جلسے میں مقرر نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "تمھارے اندر ایک انسان چھپا ہوا ہے، تم بھی اچھے بن سکتے ہو۔"

یہ سن کر اس کے دل پر ایسا اثر ہوا، جیسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنی بُری باتوں پر شرمندگی ہوئی۔ اب وہ خود لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینے لگا۔ اس وقت وہ پہلے کے مقابلے میں بہت خوش تھا۔ اب اس کی عمر ۱۸ سال تھی اور چھے ماہ سے زیادہ اسکول میں اس نے تعلیم نہ پائی تھی۔ وہ ریلوں پر لکھی ہوئی چیزیں پڑھ تو لیتا تھا، لیکن مطلب دوسروں سے پوچھتا تھا۔ اسے نہ حساب لگانا آتا

تھا اور نہ لکھنا، اسی لیے اس نے دن کی جماعتوں میں یونانی زبان اور علمِ حیوانیات سیکھنا شروع کیا۔ رات میں پڑھتا لکھتا اور دن میں حساب سیکھتا تھا۔ آخر میں وہ مذہبی تعلیم کے لیے شریک ہونے جا رہا تھا کہ ایک ذرا سی چیز نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ راستے میں اسے ریل بدلنا تھی اور چوں کہ ابھی کافی وقت تھا، اس لیے الگزینڈر ہرمان کے کمالات دیکھنے چلا گیا۔

تھرسٹن کو جادوگری اور شعبدہ بازی سے بڑی دل چسپی تھی، اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح ہرمان سے بات کرے، اسی لیے اس نے ہرمان کے بازو والا کمرہ کرائے پر لیا، جس کے سوراخ سے جھانکتا اور ہرمان کو دیکھتا رہتا تھا لیکن اسے دروازہ کھٹکھٹانے اور ہرمان سے بات کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

دوسرے روز وہ مشہور جادوگر کے پیچھے پیچھے گیا۔ دونوں کے راستے مختلف تھے، مگر تھرسٹن نے بھی سامڑا کیوس کا ٹکٹ لے لیا، جہاں ہرمان جا رہا تھا۔ اس واقعے نے اس کی زندگی ہی بدل دی اور وہ جادوگر اور شعبدہ باز بن گیا! اب ایک ایک وقت میں اسے روزانہ تین تین ہزار رُپے ملنے لگے لیکن اس کا بیان ہے کہ اسے اس زمانے سے پہلے اس وقت زیادہ خوشی تھی جب وہ مڈیکل کالج کے طالب علموں کو پتّوں کے شعبدے دکھاتا تھا اور اس کی آمدنی صرف چار پانچ رُپے روز تھی!

تھرسٹن کا بیان ہے کہ دنیا میں اور بھی ایسے لوگ ہیں، جو اتنے ہی کمالات جانتے ہیں، جتنے میں لیکن میری کام یابی کا راز دو باتوں میں ہے: ایک یہ کہ میں انسانی فطرت سے واقف ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں اپنی شخصیت کو صحیح طریقے سے پیش کرتا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ جادو کے فن سے واقف ہونا جتنا ضروری ہے، اتنی ہی ضروری یہ دونوں باتیں بھی ہیں۔

تماشا شروع ہونے سے پہلے وہ اپنی ہر چیز کا امتحان لیا کرتا تھا۔ اسے اپنے تماشائیوں سے محبت تھی۔ تماشا دکھانے سے پہلے بدن میں چستی پیدا کرنے کے لیے وہ خوب اچھلتا، کودتا اور کہتا، "مجھے اپنے تماشائیوں سے محبت ہے اور میں انھیں خوش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے سامنے ایک بڑا کام ہے۔ میں خوش ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔"

وہ اس بات سے خوب واقف تھا کہ اگر وہ خوش نہ ہوا تو کوئی خوش نہ ہوگا۔ اس لیے آپ بھی یہ بات یاد رکھیے کہ دوسروں کو خوش کرنے ہی میں آپ کی کام یابی ہے۔



# ہمارے گھر

اشرف صبوحی

یہ جو تم بڑے بڑے اونچے اونچے مکان دیکھ رہے ہو کیا تم جانتے ہو کہ سدا سے ہم ایسے ہی مکانوں میں رہتے چلے آئے ہیں؟ تمھیں معلوم نہیں کہ ہمارے بڑوں کو کتنی پلٹیوں کے بعد اس طرح رہنا سہنا نصیب ہوا ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے جب انسان دنیا میں نیا نیا بسا ہے تو اس کے گھر کیسے تھے۔ ان بیچاروں کے تو خواب میں ایسی حویلیاں کبھی نظر نہ آئی ہوں گی۔ تمھارے گھروں میں بجلی کے قمقمے روشن ہیں، نلی سے چھنا ہوا پانی آتا ہے، کرسیاں ہیں، میزیں ہیں، دری، چاندنی، قالین کا فرش ہے۔ پرانے زمانے میں ان چیزوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔

تمھارے بڑوں کے دن بالکل اندھیرے تھے۔ چاند سورج کے سوا ان کے پاس اوّل اوّل کوئی روشنی نہ تھی، اینٹیں تھیں نہ چونا، نہ مکان بنانے کا دوسرا سامان، زمین پر آسمان کے نیچے سوتے، گرمی ہوئی بن مانس کی طرح درختوں پر چڑھ گئے۔ جاڑا تو جہاں کھدا ہوا غار دیکھا جا گھسے۔

مدّتوں یوں ہی بسیرا لیتے اور گزارا کرتے رہے۔ درندے اور گزندے جب انھیں ستانے لگے اور بھٹوں میں رہتے رہتے اکتا گئے تو خیال ہوا کہ ریچھوں اور بندروں کی طرح کب تک بسر کریں گے؟ کوئی صورت اور نکالنی چاہیے کہ موسموں سے بھی تکلیف نہ ہو اور بال بچّوں کو موذی جانوروں کے پنجے سے بھی نجات ملے۔ انھوں نے غاروں کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں رہنے کی جگہ تلاش کی، انھیں پہاڑوں کے دامن، درختوں کے کُنج، اور دریاؤں کے کنارے ایسے مقام مل گئے، جن کے گرد اگرد درختوں کی شاخیں لگا کر باڑے بنالیے، پھر ان دیواروں پر چھتیں ڈال دیں اور اس طرح اپنی خاصی حفاظت کرلی۔

گاؤوں میں تم نے آبادی کے باہر گھاس پھونس کے چھوٹے بڑے گنبد سے بنے ہوئے دیکھے ہوں گے، کسان ان میں اپنے جانوروں کا بھوسا چارہ رکھتے ہیں۔ انسان کا بنایا ہوا پہلا گھر بس ایسا ہی سمجھو، لیکن برسات ہوتی، دریا چڑھ آتا، ہوائیں تیز چلتیں تو پھر اپنے پرانے بھٹوں میں پناہ لینی پڑتی، اس لیے اس سے زیادہ اچھا بنانے کی فکر ہوئی۔ اور تو کچھ سوجھا نہیں، ان ہی گھروندوں کو مٹی سے لیپنا شروع کردیا اور دریا سے ذرا ہٹ کر بنانے لگے۔ اس طرح وہ پہلی بات تو نہ رہی، آندھیوں سے بھی بچاؤ ہوگیا اور آگ پانی کا بھی زیادہ ڈر نہ رہا، مگر جنگلی جانوروں سے بچنے کی صورت نہ نکلی۔ گینڈا، ہاتھی یا شیر جب کبھی آجاتا تو اس سے پناہ نہ ملتی۔

وہ لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ پہاڑ کی تلیٹیوں میں بھی رہتے تھے اور پانی کے کنارے بھی۔ پہاڑوں کے پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنے گھروں کو مضبوط کیا، اور دریا کے کنارے والوں کو کچھ اور نہ سوجھا تو انھوں نے کشتیوں سے مکانوں کا کام لیا۔ کشتیوں کو اوپر سے پاٹ کر پانی پر رہنے لگے۔ بعد میں جب انھوں نے

جنگلی جانوروں سے مقابلے کا سامان کر لیا تو پھر خشکی میں آ گئے۔ کشمیر میں ہاؤس بوٹ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

بہت زیادہ ٹھنڈے ملکوں میں جہاں بارہ مہینے برف جمی رہتی ہے، لوگ برف کے اندر کھوئیں بنا کر رہتے تھے۔ اُن علاقوں میں اب بھی وہاں کے رہنے والے برف کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ تم کو تعجب ہوگا کہ برف میں آدمی کیوں کر رہ سکتا ہے، ٹھٹھر نہ جاتے ہوں گے۔ ٹھٹھرنا کیسا؟ انھیں اتنی بھی ٹھنڈ نہیں معلوم ہوتی، جتنی یہاں ہمیں کسی پہاڑ پر سردی لگتی ہے۔ وہ ایسی زندگی کے عادی ہیں۔ ان کے برف کے مکان بڑے مضبوط اور کئی کئی درجے کے ہوتے ہیں۔ کھانا پکانا اٹھنا بیٹھنا، شادی غمی سب ان کا ان ہی میں ہوتا ہے۔

ریت کے میدانوں میں رہنے والوں نے گرمی، سردی، اوس، دھوپ سے بچنے کے لیے تنبوئیاں تانیں۔ یہ قبیلے زیادہ دن ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ اُن کی بستی چلتی پھرتی بستی ہوتی تھی۔ پہلے پہل انھوں نے بھیڑوں، بکریوں کی کھالوں کو جوڑ جوڑ کر خیمے بنائے۔ ایک لکڑی زمین میں گاڑی اور چاروں طرف کھالیں لگا دیں۔ جب کپڑا بننے لگے تو کھالوں کے بدلے کپڑے کے تنبو بن گئے۔ جو آج تک تقریباً اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔ ان کی چھولداریاں ایسی ہلکی پھلکی ہوتی تھیں کہ جب چاہا کندھے پر لاد روانہ۔ خانہ بدوشوں کا نام سنا ہوگا، یعنی کندھوں پر گھر۔ ہزاروں سال گزر جانے پر بھی انھوں نے اپنے بڑوں کا رواج نہیں چھوڑا۔ اسی طرح رہتے سہتے اور سدا سفر ہی میں بسر کرتے ہیں۔

ابتدا میں انسان نے کسی ایک جگہ اپنے ٹھکانے نہیں بنائے تھے جہاں سرسبزی شادابی دیکھی۔ کھانے پینے کی سہولتیں پائیں رہ پڑے۔ جب کمی آنے لگی چل پڑے۔ یوں ہی سینکڑوں برس ڈانوا ڈول پھرا کیے۔ پھرتے چلتے ایسے مقامات بھی انھیں مل گئے، جہاں بہار ہی بہار

تھی، خزاں کا ڈر ہی نہ تھا۔ اب انھیں اپنے آرام وراحت کی بہت سی تدبیریں سوجھ گئی تھیں۔ گنجان جنگلوں میں رہتے رہتے گھبرا گئے تھے۔ کھلے میدانوں کی آب و ہوا پسند آئی، دریا کے کناروں کی گیلی مٹی سے کام لیا، کچے ڈھابے بنالیے رفتہ رفتہ انھیں تھاپنے لگے۔ پھر اینٹیں پکانی شروع کیں۔ اس کے بعد جن بھٹوں میں انھیں پکاتے تھے، کچھ اینٹیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ انھیں پیس کر گارا بنایا، گارے سے چونا نکلا، اب کیا تھا، آدمی کو ترقی کا راستہ مل جانا شرط ہے، لگے آسمان سے باتیں کرنے، چناں چہ آج دیکھ لو کیسی کیسی عمارتیں بن گئی ہیں اور زندگی نے کیا ڈھنگ اختیار کرلیا ہے۔ کہاں وہ جانوروں کے گھپ اندھیرے بھٹ، کہاں یہ بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہوئے محل، کوٹھیاں اور بنگلے۔

اللہ اللہ عقل کے بھی کیا کرشمے ہیں۔

---

# دنیا کا سب سے پُرانا مجسّمہ کہاں ہے؟

مصر میں قاہرہ کے قریب ابوالہول کا بت دنیا کا سب سے پرانا مجسّمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اونچائی سو فیٹ سے زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں پتھر سے تراشی ہوئی کوئی ایک شکل اتنی بڑی نہیں ہے۔ ابوالہول کا پورا مجسّمہ ایک چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے۔ صرف پنجوں کی جگہ پتھر کے علیحدہ ٹکڑے لگائے گئے ہیں۔

---

ایک جاپانی کہانی

# مونوگوسا

## ایک کاہل ——— ایک شاعر ——— ایک شاہ زادہ

"وَاقعی تم ایک اچھے شاعر بھی ہو، ضرور تم کسی اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہو! کیا اپنے باپ دادا کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

ترجمہ:
عارف حجازی



قدیم جاپانی زبان میں ایک لفظ "مونوگوسا" (MONOGOSA) ہے، جس کے معنی کاہل اور سُست کے ہیں۔ صدیوں پہلے یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں جاپان کے صوبے شینانو کے ایک شہر میں تارو نامی ایک آدمی رہتا تھا۔ شہر سے دُور ایک سنسان سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹیا میں پڑے پڑے وہ صبح سے شام اور شام سے صبح کر دیتا، مگر نہ تو وہ اپنی کٹیا سے باہر نکلتا اور نہ کسی کام کاج کی تلاش میں شہر جاتا۔ بس

وہ یونہی اپنی زندگی بے مقصد طریقے پر بسر کر رہا تھا۔

ایک روز ایک شخص تارو کو پانچ میٹھی روٹی کی ٹکیاں دے گیا۔ تارو کئی دن کا بھوکا تھا۔ روٹی ملی تو بہت خوش ہوا اور بڑی بے صبری سے چاروں ٹکیاں کھا گیا۔ جب ایک ٹکیا ہاتھ میں رہ گئی تو اسے خیال آیا کہ "میں اسے پھر کسی وقت کے لیے رکھ چھوڑوں۔ جب کوئی اور آدمی کھانے کی کوئی چیز دے جائے گا تو اس وقت اس ٹکیا کو کھا لوں گا اور اُس چیز کو پھر کسی وقت کے لیے رکھ چھوڑوں گا۔"

وہ اسی سوچ میں بیٹھے بیٹھے اس بچی ہوئی ٹکیا سے کھیلنے لگا۔ اتفاق سے وہ ٹکیا ہاتھ سے پھسل کر دور سڑک پر لڑھکتی ہوئی چلی گئی۔ کٹیا اونچی جگہ پر تھی اور سڑک ڈھلوان تھی، اس لیے ٹکیا کے لڑھکنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہوئی۔ اب تارو میاں لگے افسوس کرنے، مگر اتنا نہ ہوا کہ اپنی کٹیا سے نکل کر ٹکیا سڑک پر سے اٹھا لاتے، بلکہ اس انتظار میں رہے کہ کوئی وہاں سے گزرے تو اس سے کہہ کر ٹکیا کو اٹھوالیں، مگر اسی انتظار میں دو دن گزر گئے اور وہ اپنی کٹیا ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹکیا کی نگرانی کرتے رہے۔ کوئی کتا یا پرندہ سڑک پر سے گزرتا تو وہ بیٹھے بیٹھے بس "شی شی" کر کے اس کو بھگا دیتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ تارو میاں اپنی کٹیا میں بے کار پڑے پڑے بڑے کاہل ہوگئے تھے اور ایک قدم چلنا بھی ان کے لیے دوبھر ہوگیا تھا۔

اس کاہلی اور آرام طلبی نے جیسے ان کے ہاتھ پاؤں کی قوت بھی چھین لی تھی۔ غرض تیسرے دن صوبے شینانو کے گورنر کا اُدھر سے گزر ہوا۔ وہ شکار سے واپس آرہا تھا، اس کے ساتھ اور بھی بہت سے آدمی تھے۔ چناں چہ جیسے ہی وہ لوگ تارو کی کٹیا کے قریب سے گزرے تو تارو اپنی کٹیا سے بیٹھے بیٹھے پکار کے بولا،

"ذرا سنیے تو، آپ کی مہربانی ہوگی، میری میٹھی روٹی کی ٹکیا اٹھا کے مجھے دے دیجیے۔" تارو پکار پکار کے کہتا رہا، مگر کسی شخص نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔

آخر جب گورنر اپنے گھوڑے پر سوار اس کی کٹیا کے پاس سے گزرا تو تارو نے پھر پکار کے کہا، "ذرا ٹھیریے، میری ٹکیا اٹھا دیجیے!"

گورنر بڑا ہمدرد اور رحم دل آدمی تھا۔ وہ تارو میاں کی آواز سُن کر اُن کے پاس آیا اور پوچھا، "کیوں میاں، تم تارو تو نہیں ہو۔ میں نے تمھارے متعلق بہت کچھ سُن رکھا ہے؟"

تارو میاں یہ سُن کر ذرا بھی نہ جھجکے اور فوراً جواب دیا، "جی ہاں، میں ہی وہ مشہور کاہل تارو ہوں!"

گورنر مسکرایا اور کہنے لگا، "میاں تارو، یہ تو بتاؤ آخر تم کب تک اس طرح پڑے پڑے اپنی زندگی گزارو گے؟"

تارو نے جواب دیا، "میں کاہل ہو گیا ہوں اور کسی کام کے قابل نہیں بس اسی طرح رات دن گزار سکتا ہوں۔"

اِس طرح تو تمھیں پیٹ بھرنا بھی مشکل ہو جائے گا اور تمھاری صحت بھی خراب ہو جائے گی۔"

"کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ تو کھانے کو دے ہی جاتا ہے، لیکن اکثر فاقے ہی سے گزار دیتا ہوں۔ بعض دفعہ تو مجھے دس دس دن فاقے سے رہنا پڑتا ہے۔"

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم اتنے تن درست ہو کر کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں کے سہارے زندگی گزار رہے ہو۔ اگر میں تمھیں چاول کا ایک کھیت دے دُوں تو کیا تم کاشت کر کے اپنی گزر کرنے کے لیے تیار ہو؟" گورنر نے دریافت کیا۔

"شکریہ، کھیتی باڑی کرنے سے بہتر ہے کہ میں چپ چاپ اپنی کٹیا میں پڑا رہوں۔" تارو نے جواب دیا۔

"تو پھر تم رُپیہ مجھ سے لے لو اور کوئی تجارت کر لو۔"

"یہ کام بھی میرے لیے بہت مشکل ہے، آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔"

"سمجھا، آخر جو کچھ میں نے سُن رکھا تھا، وہ سچ ہی نکلا۔ واقعی تم جاپان کے سب سے زیادہ کاہل انسان ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تم اپنی اس کاہلی کی بہ دولت فاقے کرتے کرتے مرجاؤ گے۔ میں تو تمھیں باعمل انسان بنانا چاہتا تھا، تم کو میری کوئی شرط پسند نہیں آئی۔"

گورنر نے بڑے رنجیدہ ہو کر کہا اور اپنے میر منشی سے ایک کاغذ مانگا۔ اس نے اس پر یہ حکم لکھا: "اِس کاہل تارو کو روزانہ پندرہ اونس چاول اور دونوں وقت چائے مہیا کی جائے۔ اگر کوئی شخص اس حکم کے خلاف کریگا تو اسے ملک بدر کردیا جائیگا۔"

گورنر کے حکم کو صوبے کے گاؤں گاؤں میں پہنچا دیا گیا، مگر تارو کو اس حکم کا علم نہ ہوا۔ لوگ اسے روزانہ کھانے کے لیے پہنچا دیا کرتے اور اب وہ نہایت چین سے کھا پی کر پنی جھونپڑی میں پڑا اینڈھتا رہتا۔ اِسی طرح تین سال گزر گئے۔ اس دوران شہنشاہ جاپان نے ایک فرمان (حکم) جاری کیا کہ اسے چند نہایت تن درست اور مضبوط نوجوانوں کی ضرورت ہے، جنھیں محافظوں کا کام انجام دینا ہوگا۔ اس فرمان کی خبر پاکر ایک آدمی نے تارو سے کہا کہ وہ شہنشاہ کی ملازمت اختیار کرلے تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔

تارو اس آدمی کی بات پر پہلے ٹال مٹول کرتا رہا، آخر ایک دن نہ جانے اس کے جی میں کیا آیا کہ فوراً دارالحکومت جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اور اس آدمی کو لے کر دارُالحکومت کیوٹو پہنچا۔

دارُالحکومت صوبہ شینانو سے بہت دُور تھا، مگر بڑا خوب صورت شہر تھا۔ عالی شان عمارتیں، محلات، صاف ستھری سڑکیں اور پُر رونق بازاروں کو دیکھ کر تارو ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس نے وہاں کے لوگوں کو بڑے اچھے اچھے اور رنگ برنگے لباس پہنے دیکھا تو اسے دل میں بڑی شرم آئی۔

دارالحکومت صوبہ شینانو سے بہت دور تھا، مگر بڑا خوب صورت شہر تھا۔ عالی شان عمارتیں، محلات، صاف ستھری سڑکیں اور پُر رونق بازاروں کو دیکھ کر تارو ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس نے وہاں کے لوگوں کو بڑے اچھے اچھے اور رنگ برنگے لباس پہنے دیکھا تو اُسے دل میں بڑی شرم آئی۔ اس کا میل جما کالا رنگ، پھٹے پُرانے، میلے کچیلے کپڑے، گھاس کی طرح بڑھے ہوئے سر کے لمبے لمبے بال، جانوروں کے پنجوں کے سے

لمبے لمبے ناخن، یہ تمام چیزیں ایسی تھیں کہ اسے ان سے نفرت ہونے لگی۔ چناں چہ اس نے سب سے پہلے اپنا حلیہ درست کیا اور خوب نہا دھوکر صاف ستھرا لباس پہنا، پھر شہنشاہ کے دربار میں پہنچا۔ بے خوف ہوکر بڑے اکھڑ پن کے ساتھ شہنشاہ سے بولا، "میرا نام تارو ہے۔ میں صوبے شینانو سے آپ کا فرمان (حکم) سن کر پیدل آیا ہوں۔ مجھے آپ اپنے دربار میں ملازم رکھ لیں، میں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

شہنشاہ پہلے ہی اِس نوجوان کے متعلق سُن چکا تھا۔ تارو کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا اور بولا، "شاباش، مجھے تم جیسے نوجوان کی ہی ضرورت ہے۔ دل لگاکر اور بے خوف ہوکر کام کرو، میں ہر طرح تمھاری مدد کروں گا۔"

تارو شہنشاہ کے محافظوں میں شریک کرلیا گیا۔ اسے وہاں ہر طرح کا کام کرنا پڑتا۔ وہ روزانہ صبح ہی اٹھتا اور باغ کو سینچتا، صفائی کرتا، پھر سورج چڑھتے ہی دیوان خاص کے صدر دروازے پر آدھی رات تک پہرہ دیا کرتا۔ اگر شہنشا سے ملنے کے لیے کوئی آتا تو اِطّلاع کرتا یا شہنشاہ کہیں جاتا تو اس کا لباس ٹھیک کرتا۔ غرض کہ وہ ہر کام بڑی خوبی اور تیزی سے انجام دینے لگا۔ شہنشاہ اس کی ایمان داری، محنت اور مستعدی سے بے حد خوش تھا۔ آخر کچھ عرصے کے بعد خاص محل کے خدمت گاروں میں شامل کرلیا گیا۔

ایک روز تارو شہزادی کی خواب گاہ میں صفائی میں مصروف تھا کہ اس کا ہاتھ غلطی سے شہزادی کے ارگن (باجے) سے ٹکرا گیا اور باجے کے تار ٹوٹ گئے۔ شہزادی کو یہ باجا بے حد عزیز تھا، جب اُسے اس کے ٹوٹ جانے کا عِلم ہوا تو اُسے بے حد رنج

شہزادی کو یہ باجا بے حد عزیز تھا۔ جب اُسے اس کے ٹوٹ جانے کا عِلم ہوا تو اسے بے حد رنج ہوا اور اس نے اسی غم میں ایک نہایت درد بھری نظم لکھی، مگر وہ نامکمل چھوڑ کر اُٹھ گئی۔

ہوا اور اس نے اسی غم میں ایک نہایت درد بھری نظم لکھی، مگر وہ نامکمل چھوڑ کر اُٹھ گئی۔ تارو نے نظم کو پڑھا تو اسے بے حد افسوس ہوا اور دل ہی دل میں اپنی غلطی پر ملامت کرتا رہا۔ آخر اس کا دل اس نظم کے تاثر سے بھر آیا اور وہ گنگنانے لگا اور گنگناتے گنگناتے اس نے اس نظم کو مکمل کرلیا۔ یہ بڑی اچھی نظم تھی۔ جس وقت تارو نہایت درد بھری آواز سے پڑھ رہا تھا کسی درباری نے اس کی آواز سُنی اور وہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے شہنشاہ سے تارو کی بہت تعریف کی۔ شہنشاہ نے اسے اپنے دربار میں بُلا کر کہا، "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم شعر بھی کہتے ہو۔ اگر کوئی اور نظم اِسی وقت کہہ دو تو ہم تمھیں بہت سا انعام دیں گے۔"

تارو بڑا حیران تھا کہ وہ کیا کرے، اسی وقت قریب ہی صنوبر کے درخت پر ایک بلبل بیٹھی ہوئی نغمہ سرائی کررہی تھی، تارو کا دل اس کی شیریں آواز پر پھڑک اٹھا اور اس نے ایک نہایت عمدہ نظم کہہ کر شہنشاہ کو پیش کردی۔ شہنشاہ خوش ہوکر بولا، "واقعی تم ایک اچھے شاعر بھی ہو۔ ضرور تم کسی اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ کیا تم اپنے باپ دادا کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

تارو نے جواب دیا، "مجھے ان کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کون تھے۔"

تارو کا جواب سُن کر شہنشاہ کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے صوبہ شینانو کے گورنر کو تارو کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے لکھا۔ گورنر نے بڑی چھان بین کے بعد آخر پتہ چلا لیا کہ تارو قدیم جاپانی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والدین کو جلا وطن کرکے شینانو بھیج دیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ اس کے والدین جلا وطنی کے زمانے میں اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چل بسے اور تارو کی پرورش کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس طرح وہ ایک عام آدمی کی طرح سڑک کے کنارے کٹیا میں پل کر بڑا ہوا۔

شہنشاہ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے تارو کو ایک علیحدہ محل دیا اور اسے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس طرح کاہل اور سُست تارو اپنی محنت، عقل مندی اور ایمان داری کی بدولت ایک اچھی زندگی بسر کرنے لگا۔

# تین بہادر ملّاح

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر کی لہریں خوف ناک شور پیدا کر رہی تھیں اور سمندر کی ان لہروں پر ایک جہاز آہستہ آہستہ اسپین کی ایک بندرگاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاز پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان افسر نے چیخ کر اپنے کپتان سے کہا، "کپتان صاحب، جہاز بالکل سامنے ہے، لیکن وہ تو کوئی آب دوز کشتی معلوم ہوتی ہے۔"

اس نوجوان افسر کا نام پکرنگ تھا۔ پکرنگ جہاز کے نوجوان افسروں میں سے ایک تھا۔ اُسے سامنے ایک جہاز نظر آرہا تھا، جسے وہ آب دوز سمجھ رہا تھا۔ آب دوز کشتی اسے کہتے ہیں، جو پانی کے نیچے چلتی ہے۔ اس نے چیخ کر اپنے کپتان کو اس لیے کشتی کے متعلق بتایا تھا کہ اسے یہ معلوم تھا کہ دو دن پہلے جہاز کے ریڈیو



پکرنگ اور اس کے ساتھی ٹوٹے ہوئے جہاز کے قریب پہنچ گئے۔

پر اس نے ایک پیغام سنا تھا کہ امریکا کا ایک جہاز ڈوب رہا ہے اور اس جہاز پر کام کرنے والوں کو کشتی کے ذریعے جان بچانے کے لیے جہاز سے اتارا جا رہا ہے۔ پکرنگ اور پکرنگ کے جہاز کے تمام افسر، یہاں تک جہاز کا کپتان بھی ڈوبنے والے امریکی جہاز کی تلاش میں تھا، اس لیے کہ ڈوبنے والا جہاز اگر مِل جاتا اور اس میں کا کچھ سامان وہ لوگ بچانے میں کام یاب ہو جاتے تو انھیں بہت فائدہ پہنچتا۔ جہاز پر کام کرنے والے ہر آدمی کو اس سے فائدہ پہنچتا۔ پکرنگ کی آواز سنتے ہی جہاز کا کپتان بھی اس کے قریب پہنچ گیا اور گلے میں لٹکی ہوئی دُوربین اس نے اپنی آنکھوں پر چڑھائی، لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

"اس سمندر میں کسی آب دوز کشتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،" پکرنگ کے ایک ساتھی نے کہا۔

"تو پھر وہ آخر کیا چیز ہے؟" پکرنگ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "طوفان گزر جانے کے بعد آخر یہ کیا چیز ہے، جو سمندر کی سطح پر اس طرح تیرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔" جلد ہی پکرنگ کی سمجھ میں آگیا کہ دور سے نظر آنے والی وہ چیز ہی کیا؟ اور اس نے چیخ کر کہا، "کپتان صَاحب، یہ تو وہی جہاز معلوم ہوتا ہے، جس کے ڈوبنے کی خبر ہم نے کل سنی تھی۔ شاید جہاز والے اسے ڈوبتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے، لیکن جہاز ابھی تک ڈوب نہیں سکا۔"

پکرنگ کا جہاز، جس کا نام ہوپ ویل تھا، جیسے جیسے اس امریکی جہاز کے قریب پہنچا تو ہوپ ویل کے آدمیوں کو معلوم ہو گیا کہ ڈوبنے والے جہاز کا درمیانی حصّہ بالکل ٹوٹ چکا ہے البتہ سَامنے کا حصّہ اور پچھلا حصّہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ پھر انھیں ایک ٹوٹی ہوئی چمنی بھی نظر آئی۔ ٹھیک اسی وقت ہوپ ویل کے کپتان نے چیخ کر اپنے دوسرے افسروں سے کہا، "خدا کی قسم وہ جہاز ابھی ڈوبا نہیں۔ اب یہ تمھاری ہمت پر ہے کہ تم اسے باہر کھینچ لاؤ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

جہاز کے دوسرے افسر بھی دیکھ

رہے تھے کہ طوفان گزرنے کے دو دن بعد بھی جہاز ڈوبا نہیں تھا، حالاں کہ وہ جہاز بالکل خالی تھا اور اس کی وجہ سے دوسرے جہازوں کے لیے وہ ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔

آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوپ ویل کو سانتا بار برا نام کی ایک بندرگاہ پر پہنچنا تھا، تاکہ وہاں سے ہوپ ویل شکر لاد کر دوسرے ملک کے لیے روانہ ہو۔ راستے ہی میں چوں کہ طوفان آگیا تھا، اس لیے وہ مقررہ وقت پر بندرگاہ پر نہ پہنچ سکا تھا۔ اب کپتان کو ایک طرف تو بندرگاہ پہنچنے کی جلدی تھی، دوسری طرف جہاز کے دوسرے تمام افسروں کا مشورہ تھا تاکہ اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کا انعام مل سکے۔ آخر کار تمام افسروں کے مشورے کے بعد کپتان نے فیصلہ کیا کہ اگر جہاز کو بچانا ہی ہے تو یہ کوشش سورج غروب ہونے سے پہلے کر لینی چاہیے اور اس مقصد کے لیے کپتان نے جہاز پر سے ایک چھوٹی کشتی اور تین افسر لے جانے کی اجازت بھی دے دی۔

ان تین افسروں میں سے ایک انجنیئر بھی تھا تاکہ ڈوبنے والے جہاز کے انجن کو ٹھیک کر کے جہاز کو کھینچ کر بندرگاہ تک پہنچایا جا سکے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہوپ ویل سے ایک کشتی سمندر میں اتاری گئی۔ اس کشتی میں چھے آدمی تھے۔ تین تو اس کشتی پر کام کرنے والے اور تین وہ لوگ، جنھیں اس ٹوٹے ہوئے جہاز پر کام کرنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ کشتی ٹوٹے ہوئے جہاز کے قریب پہنچی تو ان تمام آدمیوں کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس جہاز کے دروازے، روشن دان، ہَوا دان سب ہی ٹوٹے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جہاز کے اوپر، جو لوہے کا جنگلہ لگا ہوتا ہے، وہ بھی ٹوٹا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود جہاز ابھی تک ڈوبا نہیں تھا۔ ہوپ ویل افسروں کے لیے جہاز کا نہ ڈوبنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ کشتی جب جہاز کے اور قریب پہنچی تو انھیں جہاز پر ایک جگہ "ایمپریسا" لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ اس ٹوٹے ہوئے جہاز کا نام تھا۔

ان لوگوں نے جہاز کے قریب پہنچ کر

رسیوں کی سیڑھیاں اس جہاز پر ڈالیں اور تینوں افسر جہاز پر چڑھ گئے۔ ان تینوں افسروں میں ایک تو پکرنگ ہی تھا اور دوسرے دو افسروں کے نام گوش اور وائیٹ تھے۔

جہاز پر پہنچتے ہی تینوں نے طے کیا کہ پہلے ایک مرتبہ جہاز کو سرسری طور پر دیکھ لیا جائے اور بعد میں جہاز کو بچانے کے لیے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ چناں چہ ان تینوں نے پہلے پورے جہاز کو دیکھا ——— کپتان کا کمرہ، باورچی خانہ، انجن کا کمرہ اور سونے کا کمرہ، ان لوگوں نے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ جب یہ لوگ سونے کے کمرے میں پہنچے تو اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تینوں نے اپنی اپنی بجلی کی بیٹریاں جلا لیں، جنھیں وہ ہوپ ویل سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

پکرنگ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس کی آنکھیں بہت تیز تھیں۔ یہاں بھی پکرنگ کی تیز آنکھوں نے کام کیا۔ سونے کے کمرے میں اسے ہی سب سے پہلے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نظر آیا۔ آگے بڑھ کر اس نے وہ کاغذ اٹھا لیا۔ کاغذ گیلا تھا۔

جب پکرنگ نے کاغذ کھول کر اپنی بیٹری کی روشنی اس پر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ راستہ بتانے والا نقشہ تھا۔ پکرنگ اس کاغذ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ گوش اور وائیٹ بھی اس کے قریب پہنچ گئے۔ تینوں نے وہ نقشہ بڑے غور سے دیکھا، جس کے ذریعے انھیں معلوم ہوا کہ جہاز "جبرا" نام کے کسی مقام کی سمت جا رہا تھا، لیکن انھیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ نقشے پر جس جگہ "جبرا" لکھا ہوا تھا، وہاں نہ کوئی بندرگاہ تھی، نہ کوئی آبادی۔ وہاں تو صرف ریتیلا ساحل تھا اور ساحل سے بہت دور کچھ جنگلات تھے۔ وہ تینوں بڑی دیر تک اس نقشے کو دیکھتے رہے، لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ جہاز جبرا کی سمت کیوں جا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر انھوں نے وہ نقشہ دوبارہ تہہ کر کے رکھ دیا اور وائیٹ کے کہنے پر وہ تینوں انجن کی سمت چل دیے۔

انجن کی مرمت کے بعد انھیں اس

بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ جہاز اب بغیر کسی مدد کے خود ہی بندر گاہ کی سمت جانے کے قابل ہو چکا تھا، لیکن طوفان کے جھٹکوں کی وجہ سے انجن اس قابل نہ تھا کہ تیزی کے ساتھ سفر کر سکے، حالاں کہ یہ سفر انھیں تیزی کے ساتھ پورا کرنا تھا، کیوں کہ آسمان پر گھرے ہوئے بادلوں کی وجہ سے انھیں اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ آج رات کو پھر بڑے زور کی بارش ہونے والی ہے اور ممکن ہے کہ دوبارہ طوفان آجائے، پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر آج طوفان آگیا تو ایمپرلسیا بندر گاہ تک نہ پہنچ سکے گا۔

تینوں ساتھیوں نے مل کر جہاز کے اندر کا پانی صاف کیا۔ کسی خاص ضرورت کے لیے جہاز کے ساتھ ایک چھوٹا سا انجن بھی لگا ہوتا ہے۔ اُسے بھی ان تینوں نے درست کیا۔ ابھی ان تینوں نے اس کام سے فرصت ہی پائی تھی کہ انھیں ایسا محسوس ہوا، جیسے جہاز پر نقارے بج رہے ہوں۔ گوش نے انجن والے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو ہوش کے اوسان خطا ہو گئے، کیوں کہ بارش شروع ہو چکی تھی اور بڑی زور کا مینہہ برس رہا تھا۔ ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ گوش نے فوراً



گوش کو جہاز میں سمندری گھاس کا ڈھیر مل گیا، جسے وہ اپنے دوستوں کے پاس لے آیا۔

واپس جاکر اپنے دوسرے ساتھیوں کو اطلاع دی، جس پر ان لوگوں نے ایک مرتبہ پھر جہاز کی تلاشی لی - اتفاق سے انھیں کپتان کے کمرے میں تارپولین مل گئے، جنھیں انھوں نے جہاز پر ایسی جگہ ڈال دیا، جہاں سے انجن والے کمرے میں پانی نہ آسکے، لیکن جہاز کے جو حصّے کھلے ہوئے تھے، ان سے پانی برابر جہاز میں جمع ہو رہا تھا اور اس پانی کو انجن والے کمرے میں داخل ہونے سے روکنا ضروری تھا۔ تینوں نے جہاز کی تلاشی لی تو گوش کو ایک جگہ مٹی اور سمندری گھاس کا ڈھیر نظر آیا - وہ اس گھاس کو اٹھا کر اپنے تینوں ساتھیوں کے پاس پہنچا - اس کے دونوں ساتھی انجن والے کمرے ہی میں تھے، جہاں کچھ پانی جمع ہو چکا تھا۔ گوش کے ہاتھ میں گھاس اور مٹی دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا اور تینوں نے فیصلہ کیا کہ وائیٹ، جو انجینئر ہے، انجن کی دیکھ بھال کرے اور پکرنگ بالٹیوں سے کمرے کا پانی نکال کر باہر پھینکے اور گوش گھاس اور مٹی کا ڈھیر لاکر اندر داخل ہونے والے پانی کا راستہ روکے - پھر فوراً ہی تینوں نے اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔ کافی دیر تک محنت کرنے کے بعد انجن والے کمرے سے پانی تو صاف ہو گیا، لیکن سردی سے تینوں کا بُرا حال ہو گیا اور اب ان تینوں کو کھانے کی تلاش میں پھر ایک مرتبہ جہاز کے کونے کونے کی تلاشی لینی پڑی - پھر جب باورچی خانے میں سے انھیں مچھلی کے بند ڈبّے مل گئے تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی - مچھلی کے یہ بند ڈبّے عام طور پر کسی خاص ضرورت کے لیے ہر جہاز میں رکھے جاتے ہیں، تاکہ اگر غذا ختم ہو جائے تو انھیں کھایا جاسکے - یہ ڈبّے ٹین کے ہوتے ہیں اور ان کے اندر پکی ہوئی مچھلی بند ہوتی ہے، جسے سارڈین کہتے ہیں -
سارڈین کے ساتھ ہی انھیں ایک جگہ کافی بھی مل گئی، جنھیں تینوں نے کاغذ اور سمندری گھاس پر گرم کر لیا۔ اس طرح تینوں کا پیٹ بھی بھر گیا اور سردی بھی کم ہو گئی -

رات کا باقی حصّہ انھوں نے انجن کی دیکھ بھال میں گزارا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی - اتنی دیر میں جہاز ساحل کے قریب بھی پہنچ گیا - پھر جب تینوں نے جہاز کے اوپر آکر دیکھا تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ انھیں دُور سے ساحل ایک

بھوری سی لکیر کی طرح نظر آیا۔ سَاتھ ہی دور سمندر میں دھوئیں کی ایک لکیر سی نظر آئی، جو ان کے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی۔

تینوں نے خیال کیا کہ یہ جہاز ہوپ ویل ہے، جو صبح ہوتے ہی ان کی تلاش میں نکلا ہے، لیکن وہ جہاز جیسے ہی اُن کے قریب پہنچا تو ان کی خوشی ختم ہوگئی، کیوں کہ آنے والا جہاز دراصل بحری فوج کا جہاز تھا۔ یہ جہاز جیسے ہی قریب پہنچا تو بحری فوج کے افسر بالکل اسی طرح اس جہاز پر آگئے، جس طرح پکرنگ اور اس کے ساتھی رسّی کی سیڑھیوں کی مدد سے اس جہاز پر پہنچے تھے۔

ایمپرلیسیا پر چڑھنے کے بعد بحری فوج کے افسر نے ان سے کہا کہ تمھیں ہماری مدد کی ضرورت ہوگی، اِس لیے ہم تمھیں اپنے جہاز پر بندرگاہ تک پہنچا دیں گے۔ جہاز کا افسر چوں کہ اسپین کی زبان بول رہا تھا، اس لیے پکرنگ اور اس کے ساتھیوں نے اشاروں سے اس افسر کو سمجھایا کہ انھیں اب کسی مدد کی ضرورت نہیں اور وہ خود ہی جہاز کو اس قابل بنا چکے ہیں کہ جہاز بغیر کسی مدد کے بندرگاہ تک پہنچ جائے۔ وائیٹ نے اپنے دوستوں کے مشورے پر اس افسر کو وہ نقشہ بھی بتایا جو انھیں ایمپرلیسیا میں ملا تھا۔ افسر کی نگاہیں جیسے ہی لفظ 'جبرا' پر پہنچیں تو اس نے سخت تعجب کا اظہار کیا، کیوں کہ اس نے بھی کبھی اس مقام کا نام نہیں سُنا تھا۔

پکرنگ اور وائیٹ افسر سے بات چیت کر رہے تھے اور گوش نیچے سَارڈین اور کافی لانے چلا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ کھانے پینے کی چیزیں لے کر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بحری فوج کا افسر اپنے جہاز سے چار سپاہیوں کو بلا رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے چاروں سپاہیوں سے کچھ اپنی زبان میں بات کی اور پکرنگ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "میں جبرا کو تلاش کرنے جا رہا ہوں اور جب تک میں واپس نہ آؤں اس وقت تک آپ لوگ گرفتار ہیں لیکن آپ کا جہاز بندرگاہ کی طرف چلتا رہے گا۔" افسر کے جانے کے بعد گوش نے کافی اور سَارڈین ان سپاہیوں کو کھلا کر ان سے دوستی پَیدا کرلی۔

افسر تو یہ کہہ کر اپنے جہاز پر چلا گیا اور اس کے سپاہیوں نے باقاعدہ ایمپرلیسیا پر پہرہ دینا شروع کردیا۔ ایمپرلیسیا نے

ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ انھیں ایک اور جہاز نظر آیا، جسے دیکھتے ہی پکرنگ نے فوراً پہچان لیا کہ وہ جہاز ان کا اپنا ہوپ ویل ہے۔ ہوپ ویل کے کپتان نے بھی اس جہاز کو شاید دیکھ لیا تھا، اس لیے اس نے ایک کشتی کے ذریعے تین آدمی ایمپرلسیا کی طرف بھیجے۔ ہوپ ویل کی کشتی جیسے ہی ایمپرلسیا کے قریب پہنچی تو بحری فوج کے سپاہیوں نے اُس کشتی پر اپنی بندوقیں تان لیں۔ وہ سمجھے کہ شاید یہ کشتی کسی دشمن یا لٹیروں کی ہے۔

گوش نے اپنے ساتھیوں کو پہچان کر اشاروں سے ان سپاہیوں کو سمجھایا کہ کشتی میں آنے والے ہمارے ہی جہاز کے آدمی ہیں۔ اسی وقت کشتی میں آنے والوں نے چیخ کر بتایا کہ ہوپ ویل رات کے طوفان میں راستہ بھٹک کر ریت میں پھنس گیا ہے۔ چناں چہ پکرنگ اور اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے جہاز کی مدد ضرور کریں گے۔ چناں چہ انھوں نے ایمپرلسیا کو بھی ہوپ ویل کی طرف موڑ دیا۔ بحری فوج کے سپاہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایمپرلسیا ہوپ ویل کے قریب پہنچ گیا اور رسیوں کی مدد سے ہوپ ویل کو ایمپرلسیا سے باندھ کر ریت سے باہر کھینچ لیا گیا۔ اسی وقت وہ بحری جہاز بھی ان دونوں جہازوں کے قریب پہنچ گیا، جس پر بحری فوج کا افسر جبرا نام کے مقام کو دیکھنے گیا تھا۔ پھر تینوں جہاز سانیتا باربرا،



ہوپ ویل کی کشتی جب ایمپرلسیا کے قریب پہنچی تو بحری فوج کے افسروں نے بندوقیں تان لیں۔

کی بندرگاہ کی طرف چل دیے۔

بندرگاہ پر پہنچنے کے بعد بحری فوج کے افسر نے ہوپ ویل کے کپتان اور پکرنگ کو بتایا کہ جبرا دراصل ایک گھنا جنگل ہے، جہاں ہمارے ملک کے دشمنوں نے ایک خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔ ایمپرلسیا میں ان کے لیے بندوقیں اور دوسرے ہتھیار لائے جا رہے تھے، لیکن جب ایمپرلسیا طوفان سے تباہ ہوگیا تو ایمپرلسیا کا سارا سامان انھوں نے سمندر میں پھینک دیا۔ اس واقعے کی اطلاع جب جبرا میں چھپے ہوئے دشمنوں کو ملی تو وہ لوگ بھی جنگل چھوڑ کر بھاگ گئے، لیکن اب ہم انھیں ضرور تلاش کریں گے، پھر اس نے پکرنگ اور اس کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ایک اہم نقشہ دے کر دشمنوں کے خلاف ایک اچھا ثبوت دے دیا ہے۔

بعد میں پکرنگ اور اس کے ساتھیوں کو اسپین کی حکومت نے بہت سا انعام دیا۔ اس طرح تین بہادر ملاحوں کی بہادری اور محنت نے انھیں دولت مند بنا دیا۔

---

★ استاد: حامد نقشے پر پاکستان کے دریا اور جھیلیں دکھاؤ۔

حامد: اجی، نقشے پر جھیلیں اور دریا ہوتے تو نقشے ضرور بھیگ جاتا۔

★

ایک عورت پڑوس کی ایک میت میں پرسے کے لیے گئی اور باقی عورتوں کے ساتھ مل کر روتی رہی۔ جب واپس آئی تو دیکھا کہ اس کا چھوٹا لڑکا مکان کے آنگن میں بیٹھا رو رہا ہے۔

ماں نے پوچھا، بیٹا کیوں رو رہے ہو؟

لڑکا بولا، اونہ خود تو دوسروں کے گھر جا کر رو لیتی ہو اور مجھے اپنے گھر میں بھی بیٹھ کر رونے نہیں دیتیں۔

★

مجسٹریٹ (جیب کترے سے): تم نے ایک شریف آدمی کی جیب میں کیوں ہاتھ ڈالا؟

جیب کترا: جناب کیا کرتا، ہاتھ سردی کے مارے سکڑ رہے تھے۔

# انعامی کارٹون




اِس کارٹون کا صحیح عنوان بتاؤ۔ صحیح عنوان بتانے والے نونہال کو انعام میں ایک کتاب دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ نونہالوں کی طرف سے صحیح عنوان آنے کی صورت میں قرعے کے ذریعے ایک نام عنوان کے لیے نکال لیا جائے گا۔ انعام کے سلسلے میں ادارے کا فیصلہ قطعی مانا جائے گا۔

# شکریہ

سید فضل الرحمن جعفری

بچو! تم کو اللہ میاں نے آنکھ، ناک، کان اور زبان دی ہے۔ یہ سچ ہے نا ___ اور یہ بھی سچ ہے کہ تم آنکھ سے دیکھتے ہو، ناک سے سونگھتے ہو، کان سے سنتے ہو اور زبان سے بولتے ہو۔ پھر ذرا سوچو کہ اگر تمھارے چہرہ پر آنکھ تو ہوتی، لیکن اس میں دیکھنے کی صفت نہ ہوتی ___ ناک ہوتی، مگر تم اس سے سونگھ نہ سکتے ___ کان موجود ہوتے، مگر تم کوئی بات سن نہ سکتے ___ اور تمھارے منہ میں زبان بھی ہوتی، مگر تم اسے ہلا بھی نہ سکتے۔ تم کچھ کہنا چاہتے اور وہ حرکت بھی نہ کرتی۔ تم دل کی بات زبان کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہتے، مگر تم ظاہر نہ کر پاتے۔ تو اس وقت تمھاری کیا حالت ہوتی۔ تم دل میں کہتے کہ یہ آنکھ، یہ ناک، یہ کان اور یہ زبان سب بے کار ہیں، اگر یہ اپنا کام نہیں کرتے۔ بس معلوم ہوا کہ یہ تمام چیزیں جو تمھیں اللہ میاں نے اپنے بڑے خزانے سے دی ہیں، وہ بڑی قیمتی اور مفید ہیں۔

دنیا میں ہر چیز کا بدل ہے، لیکن ان قدرتی چیزوں کا کوئی بدل نہیں۔ اس مشینری کا اگر کوئی پرزہ بگڑ جائے، تو کوئی نیا پرزہ اس کی جگہ رکھا نہیں جا سکتا۔ یہاں تک تو تم سمجھ گئے ہوگے۔ اور تمھیں ان باتوں سے پورا اتفاق ہوگا۔ اچھا اب آگے بڑھو! تم نے دنیا میں یہ دستور دیکھا ہوگا کہ لوگ آپس میں جب کوئی احسان کرتے ہیں تو اس کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم میں اس کے الگ الگ طریقے ہیں اور یہ شکریہ ہزار طریقے سے ادا کیا جاتا ہے۔ کوئی صرف یہ کہتا ہے کہ "آپ کی عنایت کا شکریہ" کوئی شکریہ کے اظہار کے لیے پھولوں کا ہار پیش کرتا ہے۔ کوئی مٹھائی کی ٹوکری اور کوئی پھلوں کی ڈالی۔ غرض دنیا میں اچھی اور کامیاب زندگی کے لیے بھی میل جول بڑھانا ضروری ہے اور اس کے لیے یہ باتیں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اب اس پر تم قیاس کر لو اور سوچو کہ اللہ میاں نے بھی تم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اتنا بڑا احسان کہ دوسرا اتنا کر نہیں سکتا۔ پھر جتنا بڑا احسان

ہے، اتنا ہی بڑا شکریہ بھی ہونا چاہیے۔ انصاف کی بات تو یہی ہے۔ پھر یہ بھی جان لو کہ اللہ میاں تم سے کسی ایسے شکریہ کا تقاضا نہیں کرتے، جس میں تم کو تکلیف پہنچے، تم مصیبت اٹھاؤ۔ تم پر ظلم ہو۔ تم سے وہ پیسے نہیں خرچ کراتا اور کوئی ایسا بوجھ بھی تم پر نہیں ڈالتا، جو تم اٹھا نہ سکو۔ وہ تم سے صرف یہ کہتا ہے کہ جو نعمتیں تم کو دی گئی ہیں، ان کا تم شکریہ ادا کرو۔ اس نے شکریہ کا طریقہ بھی یہ بتا دیا ہے کہ اس نے جو چیز تمھیں دی ہے، اسے صحیح طور پر استعمال کرو۔ اللہ میاں نے تمھیں آنکھ دے کر یہ حکم بھی دیا ہے کہ اس سے وہ کام لو جو اللہ کو پسند ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ تم ناجائز اور حرام چیزوں پر نظر نہ ڈالو۔ تم ایسا کرو گے تو تم پر بڑا گناہ ہوگا۔ اور گناہ کی سزا بھی تمھیں بھگتنی پڑے گی۔ آنکھ کے گناہ سے اگر تم نہ بچ سکے تو یہ آنکھیں اللہ میاں کے ہاں خود گواہی دیں گی۔ اس طرح کان کے بارے میں بھی اللہ میاں نے حکم دیا ہے کہ اس سے اچھی باتیں سنو، وہی باتیں جو تم کو اللہ کے رسولؐ نے بتائی ہیں۔ اگر تم ان باتوں کو سنو گے تو تمھاری زندگی اچھی بن جائے گی ــــ اسی طرح زبان سے بھی تم اچھی باتیں کہو۔ تم نے یہ کہاوت سنی ہوگی کہ "پہلے تولو، پھر بولو"۔ غرض وہی باتیں اچھی ہیں جو اللہ کے رسول کے ذریعے تم کو پہنچی ہیں۔ اسی طرح ہر چیز کا استعمال اسی کام کے لیے کرو، جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔ اب اگر تم اللہ میاں کے حکم کے مطابق آنکھ، ناک، کان، اور زبان استعمال کرو گے تو یہی اللہ میاں کے حضور تمھارا شکریہ ہوگا۔ اللہ تم سے راضی ہو جائے گا اور یہی نہیں، بلکہ وہ اپنی نعمتوں کے خزانے کھول دے گا۔ قرآن شریف میں ہے۔

اور اگر تم ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں یہ نعمتیں تم پر زیادہ کر دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

پس بچو! تمھیں چاہیے کہ آنکھ، ناک، کان، زبان اور تمام اعضا سے وہی کام لو جو اللہ کو پسند ہے اور یہی اس کی نعمتوں کا شکریہ ہے۔

★



# بادشاہ، پادری، چرواہا

نگار یاسمین

یہ اُس زمانے کی کہانی ہے، جب انگلستان پر "جان" نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی رعایا اس سے سخت نالاں تھی، کیوں کہ وہ بہت ظالم تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک برائی اس میں یہ تھی کہ وہ بہت لالچی تھا۔ اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ "دولت" سے محبّت تھی۔ دولت بٹورنے کے لیے وہ ہر جائز ناجائز طریقہ اختیار کرتا رہتا۔

اس کے زمانے میں "کنٹربری" کے سب سے بڑے کلیسا میں پادری جیمز عبادت کروایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے کہیں سُن پایا کہ جیمز کے پاس بے شمار دولت ہے اور وہ شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ بادشاہ کو پہلے ہی سے جیمز سے دشمنی تھی، کیوں کہ وہ عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس نے فوراً پادری کو بلا بھیجا۔ پادری دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے کہا، "میں نے سُنا ہے کہ تمھارے پاس بے اندازہ دولت ہے؟" پادری نے جواب میں کہا، "بے شک ہے، مگر میری اپنی حق حلال کی کمائی ہے۔" پادری کے اِس جواب سے بادشاہ کو بہت غصّہ

آیا۔ اس نے پادری سے کہا،
میں تم سے تین سوال کرتا ہوں اور تین ہفتے کی مہلت دیتا ہوں اگر تم اِن سوالات کے جوابات نہ دے سکے تو تمھاری ساری جائداد ضبط کرلی جائے گی اور تمھیں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" پادری بے چارہ یہ سن کر چپ چاپ چلا آیا۔ دو ہفتے تک اس نے بادشاہ کے سوالات کے جواب سوچے، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ اس نے شہر کے مشہور عالموں سے جواب مانگے، مگر کوئی اس کی مدد نہ کرسکا۔ ایک دن جب پادری اپنی زندگی سے مایوس شہر کے باہر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ان سوالات پر غور کررہا تھا، ایک چرواہا اُدھر آنکلا۔ اُس نے پادری کو ادب سے سلام کیا اور اس کی اداسی کی وجہ دریافت کی۔ پادری نے بتایا، "بھائی، کیا کروں، بادشاہ نے تین سوالات کے جوابات مانگے ہیں۔ اگر جوابات نہ ملے تو مجھے اپنی جائداد اور زندگی دونوں بادشاہ کے حوالے کرنا پڑیں گی۔"

چرواہے نے کہا، سوال مجھے بتایئے شاید میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔ پادری نے اسے تینوں سوالات بتائے، جو یہ تھے۔ (۱) جب بادشاہ تاج پہن کر تخت پر بیٹھا ہو تو اس کی کیا قیمت ہوگی ؟ (۲) بادشاہ دنیا کا چکر کتنے عرصے میں لگا سکتا ہے ؟ (۳) بادشاہ اِس وقت کیا سوچ رہا ہے ؟ چرواہا یہ سن کر ہنس پڑا اور پادری سے بولا، "اتنی سی بات کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں۔ لایئے مجھے اپنا گھوڑا اور اپنے کپڑے دیجیے۔ میں بادشاہ کے سوالات کے جوابات دوں گا۔" پادری پہلے تو راضی نہ ہوا، مگر چرواہے کے اس یقین دلانے پر کہ اُس کی شکل پادری سے ملتی جلتی ہے، بادشاہ اُسے پہچان نہ سکے گا۔ چرواہے کی بات مان گیا اور اُسے اپنا گھوڑا اور کپڑے دے دیے۔

دوسرے دن چرواہا پادری کے بھیس میں بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور بادشاہ کو اس کے پہلے سوال کا جواب بتایا:

"حضرت عیسیٰ مسیح یہودیوں کے پاس تیس ۳۰ پنس کے عوض فروخت ہوئے تھے۔ اس حساب سے آپ کی قیمت

اُن سے ایک پنس کم یعنی ۲۹ پنس ہونی چاہیے۔"
بادشاہ یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا۔ پھر چرواہے نے دوسرا جواب بتایا: "اگر آپ سورج نکلتے ہی اپنا سفر شروع کریں اور دوسرے دن سورج نکلتے نکلتے دنیا کا سفر ختم کرلیں تو آپ کو چوبیس گھنٹے لگیں گے دنیا کا سفر کرنے میں۔" پادری کے بھیس میں چرواہے کی اِس دانشمندانہ بات پر بادشاہ بے اختیار ہنس دیا اور تیسرے سوال کا جواب مانگا۔ چرواہے نے کہا، "آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ پادری جیمز میرے سوالات کے جواب دے رہا ہے، حالاں کہ میں پادری نہیں ایک معمولی چرواہا ہوں۔" بادشاہ اب تو کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا، "او عقل مند چرواہے، پادری جیمز کے بجائے میں تمھیں کنٹربری چرچ کا پادری بناتا ہوں!" "مگر حضور، میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ آپ اُن کو اُن کی جگہ پر رہنے دیں اور اُن کا قصور معاف کر دیں۔" چرواہے نے ادب سے کہا۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟ بادشاہ جان نے چرواہے کی ذہانت سے متاثر ہو کر پادری جیمز کو معاف کر دیا اور چرواہے کو بہت سا انعام دیا۔ اس طرح چرواہے کی دانشمندی نے پادری جیمز کو بربادی سے بچالیا۔

(ایک انگریزی کہانی)

# ہنسو اور ہنساؤ

بیٹا : امی، ہمارے ابا کے سر پر بال کیوں نہیں ہیں؟
امی : اس لیے کہ وہ بہت سوچتے ہیں۔
بیٹا : لیکن آپ کے سر پر اتنے بال کیوں ہیں؟
امی : چپ رہو۔ ناشتہ کرو اور اسکول جاؤ۔

---

گاہک : (دکان دار سے) بھئی کل جو ہاتھی دانت کا کھلونا آپ سے لے گیا تھا وہ تو نقلی ہے۔
دکان دار : ارے صاحب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں، ہاتھی نے دانت ہی نقلی لگوائے تھے۔

---

امی : بیٹا! آج تم اسکول کیوں نہیں جاتے؟
بیٹا : ابا جان نے کہا تھا کہ جہاں مار پیٹ والا معاملہ ہو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

---

استاد : اسٹیشنری کسے کہتے ہیں؟
شاگرد : اسٹیشن کی دکان کو۔

...

# دو بہنیں

عابد نظامی

نجمہ، سلمہ دو بہنیں — اچھا کھائیں اور پہنیں
نجمہ رانی چھوٹی ہے — اس کی پکی روٹی ہے
سلمہ کا قد لمبا ہے — جیسے کوئی کھمبا ہے
نجمہ پڑھتی رہتی ہے — آگے بڑھتی رہتی ہے
لیکن سلمہ صبح و شام — کھیل ہی سے رکھتی ہے کام
اس سے سب کہتے ہیں پڑھ — دنیا میں کچھ آگے بڑھ
لیکن وہ کب سنتی ہے — روتی ہے، سر دھنتی ہے
پچھلے سال اکٹھے ہی — دونوں پڑھتی تھیں "اے بی"
بڑھ گئی اب آگے نجمہ — پیچھے رہ گئی ہے سلمہ

نجمہ پڑھ لکھ جائے گی
اور سلمہ پچھتائے گی

بار بار پڑھنے کے قابل

ہمارے بزرگوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی تھیں، جو ایک زمانہ گزرنے کے بعد اب بھی پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں۔

# لالچ

مولوی نذیر احمد

دیکھو کوئی آدمی بھی اس مرض سے خالی نہیں ہے۔ جس کو دیکھتے ہیں اسی فکر میں ہے کہ پگڑی تک ملے تو لے بھاگیں، لیکن سچ یہ ہے کہ یوں اپنی نیّت کو ڈانوا ڈول کیوں کرے۔ ملے گا تو وہی جو تقدیر میں ہے اسی لیے بہتر ہے کہ آدمی تقدیر پر قناعت کریں۔ لڑکوں کے لالچ اور طرح کے ہیں، جس سے ندیدہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی کھاتا ہے اور آپ کھڑے دیکھتے ہیں بلکہ کھانے والے کی طرح آپ بھی منھ چلاتے جاتے ہیں۔ یا مزے کا کھانا کوئی لذیذ چیز یا اچھا کپڑا دیکھا اور لوٹ ہو گئے ارادہ یہ کہ سب ہمیں ملے۔ یا باہر سے کوئی چیز کھانے کی آئی تو دروازے تک دوڑے گئے۔ اہا جی پلاؤ! اہا جی مٹھائی! اور لانے والے نے سر سے نہیں اتاری اور انھوں نے مانگنا شروع کیا۔ ایسا لالچ گھر کو خراب کرتا ہے۔ لوگ کہیں گے، فلانے کے بچّے کیسے بدنیت اور بھوکے ہیں۔ کھانے کو ترستے ہیں۔ بہت احتیاط کرو۔ جب باہر سے کوئی چیز آئے تو بے پروائی کے ساتھ خبر نہ ہو۔ مانگنا بڑی شرم کی بات ہے۔ اگر مانگنا منظور ہے تو چپکے سے تنہائی میں اپنی ماں سے مانگو اس کا عیب نہیں۔ پھر ایسی نیّت بھی ٹھیک نہیں کہ جو چیز ہو سب کی سب تم کو ملے۔ آخر دوسرے بچّے بھی تو ہیں اور پھر بچّے کھائیں تو بڑوں نے کیا قصور کیا ہے ان

کا بھی تو پیٹ ہے۔ ان کو بھی میٹھی چیز مزے کی معلوم ہوتی ہے۔ گھر میں جو چیز ہوگی سب کو حصّہ رسد ملے گی۔ کیا وجہ ہے کہ تم کو سب حوالے کردی جائے؟ جب دیکھتے ہیں کہ غیروں کے روبرو لڑکے بدنیّتی ظاہر کرتے ہیں اور چیز آتی دیکھ کر دوڑتے اور گرے پڑتے ہیں تو ہم کو بہت رنج ہوتا ہے کہ خدایا رنگ رنگ کی نعمتیں تو آئے دن اُن کو کھلاتے ہیں اور پھر یہ بھوکے کے بھوکے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ آخر لوگوں میں نام تو بد ہوتا ہے، آئندہ سے ان کو کچھ مٹھائی وغیرہ نہ دی جائے۔ اس کے قطع نظر بچّوں کے مزاج میں لالچ کا جڑ پکڑنا نہایت بُرا ہے۔

لالچ ایسا مرض ہے کہ ایرن کے نشے کی عادت کی طرح اس کو ترقی ہوتی جاتی ہے اور بیمار کو خبر نہیں ہوتی، لالچ کی چاٹ بچّوں کو چوری سکھاتی ہے۔ کیوں کہ جب ان کے لالچ کی جائز طریقے سے سیری نہیں ہوتی تو ان کو ناجائز طور پر چیزوں کے حاصل کرنے پر آخرکار دلیری پیدا ہوتی ہے۔

---

# بعض کیڑے اپنے آپ کو چھپا سکتے ہیں

کیکڑے سے ملتی جلتی ایک مکڑی ہوتی ہے، جس کے بدن پر چاروں طرف آئینے لگے ہوتے ہیں، یہ آئینے ایسے زاویوں سے ہوتے ہیں کہ ان میں وہی رنگ نظر آتا ہے جو آس پاس کی چیزوں کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مکڑی نظر نہیں آتی - مثلاً اگر یہ مکڑی پیلے رنگ کے پھول پر بیٹھ جائے تو پیلی نظر آتی ہے۔ اور اگر نیلے پھول پر بیٹھ جائے تو نیلی۔ اس طرح اپنا رنگ بدلے بغیر اپنے آپ کو چھپا سکتی ہے۔



# وطن کی راہ میں

قرۃ العین بہا

بچو! میں
آپ کی محفل میں پہلی
بار شامل ہو رہی ہوں۔ مجھے جنوں،
پریوں کی کہانیاں نہیں آتیں۔ میں تو اس دنیا کی
باتیں جانتی ہوں، جس میں ہم بستے ہیں۔ میں تو تمھیں کوئی ایسی
ہی کہانی سنا سکتی ہوں، جسے پڑھ کر تمھیں کچھ سوچنا پڑے گا اور جو کچھ سوچو گے
اس پر عمل بھی کرنا پڑے گا۔ میری کہانی روس کی ایک بہادر لڑکی کی کہانی ہے۔
اس کا نام زویا ہے۔ وہ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۴۱ء میں اُسے پھانسی
پر لٹکا دیا گیا۔ ہمارے یہاں کی لڑکیاں چھپکلیوں اور چوہوں سے ڈرتی ہیں۔
"اوئی" اور "اللہ" کہہ کر بہت خوش ہوتی ہیں، مگر ذرا اپنے مقابلے میں روس کی
لڑکیوں کو بھی دیکھو۔ ان لڑکیوں نے لڑائی میں بڑی بہادری دکھائی ہے۔ روس
کی لڑکیاں اپنے ملک کی قدر کرتی ہیں اور وقت پڑنے پر اس کے لیے اپنا تن
من دھن سب کچھ نچھاور کر دیتی ہیں۔ زویا بھی ایسی ہی بہادر لڑکی تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب جرمن فوجیں روس کے صدر مقام ماسکو کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ سترہ سالہ زویا نے اپنے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک چھوٹے سے فوجی دستے میں اپنا نام لکھوایا تھا۔ یہ دستہ ضلع دریا میں کام کر رہا تھا۔ اسی ضلعے کے ایک گاؤں "پت ری شووف" میں جرمن سوار فوج کا ایک بڑا دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

ایک رات زویا اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق اس گاؤں میں گھس گئی۔ اس نے وہاں جاکر جرمنوں کی بہت سی جھونپڑیاں، خیمے اور گھوڑوں کا اصطبل جلا ڈالا۔

دو دن بعد زویا اپنے دستے میں واپس آئی۔ تھکی ماندی زویا نے ابھی پوری طرح دم بھی نہ لیا تھا کہ کمانڈر کا دوسرا حکم آپہنچا۔ زویا ایک بار پھر دشمن کے پڑاؤ میں چپکے سے پہنچ گئی۔ اس نے ایک بہت بڑے اصطبل میں آگ لگانے کی کوشش کی، جس میں جرمنوں کے تقریباً دو سو گھوڑے بندھے ہوئے تھے، لیکن جانتے ہو کیا ہوا؟ زویا کو ایک جرمن سنتری نے گرفتار کرلیا۔

اس وقت روس میں جرمن فوجوں کا کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل روڈ تھا۔ اس نے خود زویا سے بہت سی باتیں پوچھیں، مگر اس ہمت کی پُتلی نے وطن کے سپاہیوں کا راز دشمن کو نہ بتایا۔ اس نے تو حد کردی کہ اپنا نام بھی چھپایا اور "تانیا" کے فرضی نام سے مشہور ہوتی رہی۔ اس خاموشی کی سزا اسے کیا ملی؟ شاید یہ سُن کر "نونہال" پڑھنے والے کانپ جائیں اور بہتوں کے تو آنسو بھی نکل آئیں گے۔ زویا کو جرمن سپاہیوں نے چمڑے کی پٹیوں سے خوب پیٹا۔ اس کی پیٹھ کو کوڑوں سے اُدھیڑ دیا گیا۔ برف کی سرد سِلوں پر اس کو ننگے جسم جی بھر کے گھسیٹا گیا۔ اس کو سزا دینے کی اور بہت سی ترکیبیں نکالی گئیں، لیکن واہ ری زویا، تیری بہادری پر رستم قربان، تیری دلیری پر سہراب نثار ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا اور کیا مجال کہ اس کی ہمت میں ذرہ برابر فرق آیا ہو۔

اور پھر آخر وہ دن بھی آہی گیا۔ زویا کو سزائے موت کا حکم ملا۔ جرمن

سپاہی تمام گاؤں والوں کو ہنکا کر قید خانے کی طرف لے گئے۔ زویا پھانسی کے تختے پر کسی آسمانی فرشتے کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر غرور اور فخر سے اٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وطن کا پیار اور قربانی کی چمک تھی۔ یکایک اس کے جسم کو حرکت ہوئی اور اس نے چلّا کر اپنے ساتھیوں سے کہنا شروع کیا:

"ساتھیو! یہ آج تمھارے چہروں پر افسردگی کیوں ہے؟ میرے بہادر وطن کے بہادر سپوتو! ہمّت کرو۔ آگے بڑھو۔ لڑو اور جرمن فوجوں کو مار بھگاؤ۔ ان کے ذخیروں کو جلادو۔ ان کو اتنا ستاؤ، ان کو اتنا پریشان کرو کہ یہ تمھاری سرزمین چھوڑ کر نکل جائیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اپنے ہم وطنوں کے لیے جان دینا۔ یہ تو فخر کی بات ہے اور ......"

وہ زیادہ نہ کہہ سکی۔ جلّاد نے پھندہ کس دیا اور پھندے کی گرہ زویا کی خوب صورت گردن کو دبانے لگی۔ بہادر زویا نے پھندے کی رسّی کو ہاتھوں سے پکڑ لیا، اس کو ایک بار کوشش کر کے ڈھیلا کیا اور اپنے پیر کے انگوٹھوں کے بَل کھڑے ہو کر وہ اپنی پوری قوت سے چلّائی:

" الوداع ساتھیو! الوداع، لڑائی جاری رکھنا، خوف نہ کرنا، فتح ہماری ہوگی۔ ہمارا محبوب لیڈر ہماری مدد کو ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ضرور...."

زویا مر گئی، لیکن اس نے دنیا بھر کی عورتوں کا سر اونچا کر دیا۔ سترہ سال کی اس لڑکی نے جو قربانی پیش کی ہے، اس کی مثال موجودہ دنیا میں بڑی مشکل سے ملے گی۔

روس نے زویا کی بڑی قدر کی۔ اسے "روس کی ہیروئن" کا خطاب دیا گیا۔ عام و خاص سب نے اس کو "روس کی بیٹی" کہہ کر اپنی محبت ظاہر کی۔ زویا ایک لڑکی تھی، جو دنیا سے ظلم و ستم دُور کرنے کے لیے بہادری کا نمونہ بن کر آئی تھی۔

خدا کرے ہمارے ملک میں ایسی ہی جاں نثار لڑکیاں پیدا ہوں۔ حضرت خولہؓ، رضیہ سُلطانہ، جمیلہ بوحیرد، جون آف آرک اور زویا جیسی بہادروں کی کہانیاں پھر مشہور ہوں۔

عبدالحمید نظامی




# مٹھائی

آٹھ سالہ شریف محلے کی مسجد میں ایسے ادب سے سر جھکاتے اور دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوا، گویا جانتا ہو کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے اسکول میں قدم رکھ رہا ہے اور جب وہ وضو کرنے بیٹھا تو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہی اس کا ننھا سا دل بھی وضو کر رہا تھا اور وہ پانی آنکھوں کے راستے باہر نکل رہا تھا۔

وہ آج پہلی بار مسجد میں آیا تھا۔ ویسے جب بھی وہ کسی مسجد کے قریب سے گزرتا تو فوراً اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ سوچتا یہ اللہ کا گھر ہے۔ اللہ جو سب سے بڑا ہے، جس نے اتنا بڑا آسمان اور اتنی بڑی زمین اور سورج اور چاند تارے بناتے ہیں، جس نے سارے جہاں کو پیدا کیا ہے۔ وہ شاید رات کو یہاں آتا ہوگا۔ اسی لیے وہ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ جانے اس نے میرے ابا کو کیوں بلالیا اور اب نہ جانے وہ کہاں ہوں گے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات اس کے معصوم ذہن میں گھومنے لگتے۔ اس رات وہ اپنی ماں سے بہت سے سوال پوچھتا۔

شریف کی ماں بیوہ تھی۔ شریف کا باپ پانچ چھے سال ہوئے مر گیا تھا۔ شریف کا ایک بڑا بھائی تھا، جو اس سے عمر میں تین سال بڑا تھا۔ ماں محنت مزدوری کرکے، سِلائی کڑھائی کا کام کرکے ان کی اس طرح پرورش کر رہی تھی کہ انھیں یتیمی کا احساس نہ ہو۔ وہ جیسے تیسے انھیں تعلیم بھی دلا رہی تھی، تاکہ وہ بڑے ہو کر باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ وہ انھیں بلند کردار، پاکیزہ صفات اور راست گفتار انسانوں کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جب رات کو تینوں ماں بیٹے بستروں پر لیٹ جاتے تو وہ باتوں ہی باتوں میں بچّوں کو اسلام کے بڑے بڑے اصول بتاتی، اللہ، رسول، اولیائے کرام، جنت، دوزخ، نیکی بدی، ثواب عذاب وغیرہ کا ذکر کرکے ان کے دل میں مذہب اور اچھی باتوں کا شوق پیدا کرتی۔

اس کی اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ دونوں بچوں کی عادتیں بگڑنے کے بجائے پسندیدہ اور تعریف کے قابل بن گئی تھیں، وہ شرارتوں اور فضول باتوں سے کوسوں دور رہتے تھے۔ لڑنا جھگڑنا تو درکنار انھوں نے کبھی کسی بزرگ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات تک نہ کی تھی۔ محلے میں کسی چھوٹے بڑے کو ان سے کسی قِسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی، بلکہ ہر ایک ان سے محبت کرتا تھا۔

شریف اور اس کا بھائی مجید صبح کو صبر شکر کے ساتھ روکھی سوکھی روٹی کھا کر خوشی خوشی اسکول چلے جاتے۔ چھٹی ہونے پر گھر آتے۔ پہلے اسکول کا کام کرتے، پھر گھر کے کام دھندے میں ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ اس سے فرصت ملتی تو محلّے والوں کا بھی سودا سلف لا دیتے۔ محلّے میں کئی گھرانے ایسے تھے جہاں کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ انھیں ان گھرانوں کے کام کرنے میں بڑی خوشی ہوتی اور وہ لوگ بھی دعائیں دے دے کر زبان سکھا لیتے۔ ان ہی دعاؤں کے طفیل وہ کبھی کسی امتحان میں فیل نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنی جماعتوں کے ذہین ترین اور ہوشیار بچوں میں شمار ہوتے تھے۔

لیکن تین روز سے ان کی ماں بستر پر پڑی بخار میں تپ رہی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر بچّوں کو دو

روٹی ہی ڈال دے۔ گھر میں ایک پھوٹی کوڑی اور آٹے کی ایک چٹکی تک نہ تھی۔ جب وہ کام ہی نہ کر سکی تھی تو پیسے کہاں سے آتے۔ کسی کی مدد لینا اس نے آج تک کبھی گوارا نہ کیا تھا۔ بچوں کو فاقے سے دیکھ دیکھ کر اس کا دل خون ہوا جا رہا تھا، مگر وہ مجبور اور بے بس تھی۔ سینے میں درد اور شدت کے بخار نے اسے بے دم کر دیا تھا۔ اگر دوا دارو ہو جاتی تو کچھ افاقہ پڑتا، مگر دوا دارو کرنے والا اس کا کون بیٹھا تھا۔ وہ درد سے تڑپ رہی تھی اور شریف بھوک سے نڈھال ہو کر بلک رہا تھا۔

شریف نے ماں کے سرہانے پٹی سے لگ کر بھولپن سے کہا،

"امّی، میں نے کل بھی سارا دن روٹی نہیں کھائی اور آج بھی صبح سے بھوک لگ رہی ہے۔ اب تو روٹی پکا دو!"

یہ سن کر بیمار ماں کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شریف کے سر پر مامتا کا محبّت بھرا ہاتھ پھیر کر بولی،

"بیٹا! صبر سے کام لو۔ روتے ہو اور اللہ میاں سے دعا نہیں کرتے کہ وہ تمھیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دے۔ خدا بڑا مہربان ہے۔ وہ کہتا ہے جب تم دکھ اور مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ تو مجھ سے التجا کرو۔ میں تمھاری مدد کروں گا اور واقعی وہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ سارے جہاں کو وہی پالتا ہے۔ وہ بہت طاقت والا ہے۔ سارے خزانوں کا وہی مالک ہے۔"

شریف اپنی بھوک بھول گیا۔ حیرت سے ماں کی باتیں سنتا رہا، پھر بولا،

"اچھا امی اگر میں دعا مانگوں تو خدا مجھے مٹھائی بھی کھانے کے لیے دے گا؟"

"بے شک!" اس کی ماں نے اسے بہلاتے ہوئے کہا۔ شریف کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ وہ سوچنے لگا دیکھنا چاہیے اللہ میاں کیسے مٹھائی بھیجتے ہیں۔ اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا،

"اچھا امی میں اللہ سے دعا کرنے جاتا ہوں تم آرام کرو!"

شریف گھر سے نکل کر گلی میں پہنچا تو اس کے کانوں میں آواز آئی: "اللہُ اکبر! اللہُ اکبر!" محلے کی مسجد میں

ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ اللہ کا نام سُن کر ننھے شریف کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کچھ دیر بعد ڈرتا ڈرتا مسجد میں داخل ہوا۔ نمازی صفیں باندھے سر جھکائے بارگاہِ خداوندی میں مؤدب کھڑے تھے۔ شریف بھی وضو کر کے یہ دیکھنے کے لیے کہ اللہ میاں کہاں ہیں، سب سے اگلی صف میں پہنچ گیا نماز پڑھنے کے بعد نمازیوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے شریف نے بھی دھڑکتے ہوئے دل سے دعا شروع کر دی:

"اللہ میاں! تم جانتے ہو ہمارا باپ مر گیا ہے۔ امی کہتی ہیں تم سب کو پالتے ہو۔ جن کا باپ نہیں ہوتا، انھیں کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں دیتے ہو۔ میری امی بھی بیمار ہے۔ آج اس کے پاس نہ پیسے ہیں اور نہ آٹا اور نہ روٹی ہے۔ ہم سب کل سے بھوکے ہیں۔ مٹھائی تو میں نے آج تک نہیں کھائی۔ اللہ میاں، تم بہت دولت والے ہو۔ سارے خزانے تمھارے پاس ہیں۔ پھر تم ہمیں روٹی اور مٹھائی کیوں نہیں دیتے!"

نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے، مگر شریف کا دل اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ وہ اس امید پر تھا کہ ابھی اللہ میاں اس کے لیے اچھے اچھے کھانے اور مٹھائیاں لیے آتے ہوں گے۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھائے دُعائیں مانگتا رہا اور اپنی معصوم خواہشوں کو بیان کرتا رہا، حتٰی کہ اسے نیند آ گئی۔

بہت دیر بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ سنولا چکی تھی۔ فاقے کی کمزوری نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور بمشکل گھر کی طرف چلا۔ گھر پہنچ کر اس کی حیرت و مسرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ سالن اور روٹیوں کے علاوہ چاول اور آٹے کی دو بوریاں اور مٹھائی کا ایک طشت بھرا ہوا رکھا ہے۔ مجید کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہے اور اس کی ماں مسکرا رہی ہے۔ بے اختیار والہانہ خوشی کے ساتھ وہ امی سے لپٹ گیا، "امّی! کیا یہ سب سامان اللہ میاں نے بھیجا ہے؟" اس کی ماں نے اس کا گال تھپتھپا کر کہا، "بے شک بٹیا! یہ سب خدا کی دین ہے۔ اس نے تمھاری دعا قبول کر لی۔ جب تم مسجد میں رو رو کر

خدا کے حضور میں دعائیں مانگ رہے تھے۔ محلے کے ممبر حکیم صاحب بھی تمھارے پاس ہی نماز پڑھ رہے تھے۔ تم نے شاید انھیں نہ دیکھا ہو، مگر انھوں نے تمھاری دُعا سُن لی اور اللہ میاں نے ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے گھر جاتے ہی اللہ کے حکم سے یہ تمام چیزیں تمھارے لیے بھجوا دیں۔ اللہ میاں ایسے ہی نیک بندوں کے ذریعے مصیبت زدوں کی مدد کرتا ہے۔ آؤ ہم سب مل کر پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور دعا کریں کہ وہ حکیم صاحب کے مال اور عمر میں برکت دے، پھر ہم سب بیٹھ کر اس کی نعمتوں سے اپنا پیٹ بھریں۔

---



مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں

# اخبارِ نونہال

## ہاتھی بھی سوگ مناتے ہیں

ہاتھیوں میں بھی "انسانی" خوبیاں پائی جاتی ہیں اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کی موت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ایڈورڈ ہینڈل نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جب وہ لندن کے چڑیا گھر کے سائنسی ڈائریکٹر تھے تو انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہاتھی اپنے ضعیف، بیمار، زخمی یا مرے ہوئے ساتھیوں کی حالت پر پریشانی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس قسم کے جذبات کا مظاہرہ حال ہی میں کینیا میں بھی ہوا۔ وہاں ایک خاص علاقے میں ہاتھیوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا ان کی تعداد کم کرنے کی غرض سے بہت سے ہاتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ انھیں اس طرح گولی ماری گئی کہ زندہ بچنے والے ہاتھیوں کو یہ علم نہ ہوسکا کہ کس نے گولی ماری ہے۔

ہاتھی پریشان تھے اور غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ وہ بار بار ہلاک شدہ ہاتھیوں کے پاس آتے تھے، ان کو اپنے پاؤں اور سونڈ سے ہلاتے تھے انھیں اٹھانے کی کوشش کرتے تھے، پھر دُور ہٹ جاتے تھے اور کچھ دیر بعد پھر اسی کوشش میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر ایک ضعیف ہاتھی، جو ان کا سردار معلوم ہوتا تھا، وہاں آیا اور اس نے ان بے جان ہاتھیوں سے بات کرنے کی کوشش کی اور پھر خوب زور سے چنگھاڑا۔ اس کے بعد سب ہاتھی خاموشی سے جنگل میں چلے گئے +

# داڑھی والا گِدھ — جو ہڈیاں بڑے شوق سے کھاتا ہے




داڑھی والا گِدھ (LAMMERGEYER) ایک بڑا شکاری پرندہ ہے۔ یہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہے۔ آسمان میں اُڑتا ہے اور زمین کی طرف جب آتا ہے تو اس کے نوک دار پَر ہوائی جہاز کے پَروں کی طرح ہوا کاٹتے ہیں اور دُم بھی یہی کام کرتی ہے۔ اس پرندے کی اڑان بالکل چیل کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی دُم چھینی کی طرح ہوتی ہے اور نوک دار بازو والے پر بھی چیل جیسے نہیں ہوتے۔ اس کی چونچ کے نچلے حصّے سے بالوں کا ایک گچھا نکلا رہتا ہے، جو داڑھی کہلاتا ہے۔ اس پرندے کا رنگ، اس کے پَروں اور اُڑنے کے شان دار طریقے نے اس کو دنیا کے شکاری پرندوں میں سب سے خوب صورت بنا دیا ہے۔ یہ پرندہ اٹلاس پہاڑ پر (جو شمالی افریقہ میں ہے)، اسپین میں، شمالی یورپ کے پہاڑوں پر اور کوہ قاف سے لے کر وسطی ایشیا اور کوہِ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے تک پایا جاتا

ہے۔ اِس کے متعلق بہت سی عجیب باتیں مشہور ہیں، مثلاً یہ زندہ جانور اور بچّے اٹھا کر لے جاتا ہے اور اِسی وجہ سے بعض لوگوں نے اس کی نسل کو ختم کر دیا ہے۔ موسمِ بہار میں ہمالیہ کے دامن میں یہ داڑھی والے گِد کافی پائے جاتے ہیں، مگر گرمی کے موسم میں یہ شمالی کشمیر، لدّاخ اور بلتستان کے علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ شملے کے پہاڑوں پر یہ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پرندے کبھی بھی گِد کے ساتھ کسی مُردار جانور کی لاش کو نہیں کھاتے، بلکہ جب دوسرے پرندے گوشت کھا چکتے ہیں تو یہ داڑھی والا گِد ہڈیوں کے ڈھانچے کے پاس پہنچ کر شوق سے ہڈیاں توڑ توڑ کر کھاتا ہے۔ یہ پرندوں کی معمولی پَیر کی ہڈیاں نِگل جاتا ہے، مگر جب پنجہ



اس کے منھ میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو یہ ایک منٹ کے لیے خاموش ہو کر ذرا سانس لیتا ہے اور پھر گردن کو ذرا تان کر ایک جھٹکے کے ساتھ پنجہ بھی نِگل جاتا ہے۔ بڑی ہڈیاں، یعنی جانوروں کے سامنے والے پَیر یا پچھلے پَیر کی ہڈیاں کھانے کا طریقہ بالکل انوکھا ہے۔ یہ پرندہ بڑی ہڈی کو چونچ اور پنجوں میں دبا کر اوپر لے جاتا ہے اور پھر کافی اونچائی




سے اِس ہڈی کو ایسی جگہ پھینک دیتا ہے، جہاں یہ گِر کر کسی چیز سے ٹکرائے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اگر اتفاق سے ہڈی نہ ٹوٹے تو یہ پھر اس ہڈی کو اوپر لے جا کر آسمان سے زمین پر گراتا ہے۔ اِس حرکت سے وہ گھبراتا نہیں ہے، بلکہ اس عمل کو اس وقت تک کرتا رہتا ہے، جب تک ہڈی ٹوٹ کر اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ اسے کھا سکے۔

یہ داڑھی والا گِد کچھوے بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ ایک مرتبہ اس پرندے نے ایک شخص کے گھٹے ہوئے صفا چٹ سر کو چٹان سمجھ کر اس پر آسمان سے کچھوا گِرا دیا اور وہ مر گیا۔

داڑھی والے گِد کا گھونسلا پہاڑ کے اندر کسی کھوہ میں بنا ہوتا ہے، اس میں مختلف چیزیں ہوتی ہیں، جو وہ جمع کرتا ہے۔ اس پرندے کا اوپر کا حصّہ، یعنی گردن پر سنہرے بال ہوتے ہیں۔ سر پر سفید اور تمام جسم پر کالے پَر۔ آنکھیں چاروں طرف سے گلابی گھیرے میں ہوتی ہیں اور اندر سے زرد رنگ کی۔ اس کا پنجہ بطخ کے برابر ہوتا ہے۔ چونچ کا رنگ سینگ کے رنگ کا ہوتا ہے۔ انڈے کھُردرے ہوتے ہیں اور ہلکے گلابی رنگ کے بھی اور سفید بھی۔

# صحت مند نونہال

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں
کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔
جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!



شاہدہ حنیف، کراچی



سید اعجاز حسن جعفری، کراچی



خواجہ محمد حامد رضا، دیناج پور



رعنا ظہیر النساء، حیدر آباد دکن



سمینا ناز ، لاہور



فرزانہ شبیر، اسلام آباد



واجدہ تبسم ، راولپنڈی



عبدالرشید ، کراچی



سمیع احمد ، لاڑکانہ



جگنی مخدوم ، خیرپور




# ڈاک کے ٹکٹ

کہتے ہیں کہ خط کے ذریعے آدھی ملاقات ہوجاتی ہے، یعنی جب بھی کہیں سے کوئی خط آتا ہے تو خط لکھنے والے کا چہرہ تو نظر نہیں آتا، البتہ خط لکھنے والے کے پورے حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔

آج کل تو کسی دوسرے شہر میں رہنے والے اپنے رشتہ دار یا دوست کے حالات معلوم کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ جب جی چاہا ایک خط لکھا، ڈاک خانے سے لفافہ خریدا اور ڈاک میں ڈال دیا یا سادے لفافے میں بند کر کے ٹکٹ اس لفافے پر لگائے اور بھیج دیا۔ پھر ہمارا خط ریل، ہوائی جہاز کے ذریعے یا بحری جہاز کے ذریعے ہمارے دوست تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ سارا انتظام حکومتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔







سینکڑوں سال سے پہلے جب ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے، اُس وقت بھی ڈاک کا نظام حکومتوں کے ذمے ہی تھا، لیکن اُس زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ خط پہنچانے کے لیے حکومتوں کو ہرکاروں کا انتظام کرنا پڑتا۔ ہرکارہ اس آدمی کو کہتے تھے، جو خط لے کر خود ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاتا تھا۔ پھر جب ریل گاڑی ایجاد ہوگئی تو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط بھیجنا بہت آسان ہوگیا، لیکن خرچ بہت بڑھ گیا۔







چناں چہ اس خرچ کو پورا کرنے کے لیے حکومتوں نے ڈاک کے ٹکٹ ایجاد کیے۔ ڈاک کے ٹکٹوں سے جہاں ایک طرف حکومتوں کے اخراجات پورے ہوجاتے ہیں، وہیں دوسری طرف حکومتوں کو اپنے اپنے ملک کی کسی بھی خاص چیز کو شہرت دینے کا موقع مل جاتا ہے اور دور دراز کے ملکوں کے لوگ بھی اُن چیزوں کو جان جاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں جو ٹکٹ رائج ہیں، اُن پر پاکستان کی تاریخی عمارتوں اور بعض اہم منصوبوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بھارت کے ٹکٹوں پر بھی اسی طرح کی تصویریں ہیں۔ پھر حکومتیں کسی خاص موقع پر کوئی نیا ٹکٹ جاری کرتی ہیں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس موقع کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھنا ہے۔ مثلاً پاکستان نے یوم پاکستان، یوم آزادی اور یوم انقلاب پر خاص




ٹکٹ جاری کیے یا پھر بچّوں کے عالمی دن پر بھی پاکستان نے ٹکٹ جاری کیے۔ اس طرح ہر ملک میں مختلف قسم کے اتنے ٹکٹ ہوجاتے ہیں کہ جب تک اُن کے نمونے جمع کرکے نہ رکھے جائیں اُس وقت تک تمام ٹکٹوں کی شکلیں بھی یاد نہیں رہتیں۔

بہت سے آدمیوں کو تو ڈاک کے ٹکٹ ہی جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ یورپ وغیرہ میں تو اکثر تجارتی ادارے اس قسم کے لوگوں کا شوق پورا کرنے کے لیے صرف پرانے ڈاک کے ٹکٹوں کا ہی کار بار کرتے ہیں۔ وہ بڑی محنت سے مختلف ممالک کے ٹکٹ جمع کرکے






خوب صورت سی البم بنا کر فروخت کرتے ہیں۔
ہر ملک کی حکومت یہ کوشش کرتی ہے کہ اُس کے جاری کیے ہوئے ٹکٹ خوب صورت ہوں، لیکن بعض ممالک ایسے بھی ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے ٹکٹوں کو خوب صورت بنانے کی کوشش ابھی شروع کی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں جو ٹکٹ استعمال ہوتے تھے وہ انتہائی ردّی کاغذ پر چھاپے جاتے تھے، لیکن افغانستان کے ٹکٹ اب بہت اچھے کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں اور اُن پر جو تصویریں ہوتی ہیں وہ بھی بڑی پیاری ہوتی ہیں۔
عرب ممالک میں مصر کی حکومت جسے اب متحدہ عرب جمہوریہ کہتے ہیں، مسلمانوں کی ایک مضبوط اور مشہور حکومت ہے۔ یہاں ہر سال ماؤں کا دن منایا جاتا ہے، اس دن پر عرب جمہوریہ کی حکومت خاص قسم کے ٹکٹ جاری کرتی ہے۔ اسی طرح پانامہ کی حکومت نے بچّوں کی آباد کاری کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارے کے نام پر پانامہ کی حکومت نے خاص قسم کے ٹکٹ جاری کیے۔
ملایشیا کی حکومت ہر سال انسانی حقوق کا دن مناتی ہے۔ اس دن پر وہاں کی حکومت ایک خاص ٹکٹ جاری کرتی ہے۔ غرض دنیا بھر میں اتنے ٹکٹ جاری ہو چکے ہیں کہ اب یورپ میں بعض لوگ ان ٹکٹوں کی مختلف قسموں پر مکمل کتاب لکھ رہے ہیں۔

---

## معلومات

- ریشم کا کیڑا اپنی تمام عمر میں ایک ہزار گز ریشم پیدا کرتا ہے۔
- ناروے میں کاغذوں کا گرجا بنا ہوا ہے جس میں دس ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔
- شکاگو کے عجائب گھر میں ایک بڑی ڈبل روٹی تین ہزار سال پرانی ہے۔
- دنیا میں سب سے بڑی کتاب برطانیہ کے عجائب خانے میں ہے، یہ کتاب سات فیٹ اونچی ہے، اور اس پر چاندی کے قبضے ہیں۔ اسے دوسری جگہ اٹھا کر رکھنے کے لیے تین آدمیوں کی ضرورت ہے۔
- ڈنمارک میں ایک بھی مرد یا عورت اَن پڑھ نہیں ہے۔

(آصف عابد)

# عجیب چھپکلی

چھپکلی تو تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔ یہ گھر کی دیواروں پر اکثر نظر آتی ہے۔ عام طور پر کیڑے مکوڑے کھاتی ہے۔ بعض لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ دراصل اس کی گھناؤنی صورت کی وجہ سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ہمارے اوپر نہ گر جائے۔

ہمارے گھروں میں جو چھپکلی نظر آتی ہے وہ چھپکلی کی ہندستانی قسم ہے۔ افریقہ اور برما کے جنگلوں میں بہت بڑی بڑی چھپکلیاں ہوتی ہیں جو آدمیوں کو کاٹ بھی لیتی ہیں۔ ان چھپکلیوں میں زہر بھی ہوتا ہے۔

امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے جزیرہ نما باجا میں ایک خاص قسم کی چھپکلی پائی جاتی ہے۔ یہ چھپکلی دیکھنے میں بالکل کیچوے کی طرح معلوم ہوتی ہے اور یہ رہتی بھی کیچوے ہی کی طرح ہے۔ یعنی زیادہ تر یہ چھپکلی زمین کے نیچے اپنی زندگی گزارتی ہے،



امریکا کی ریاست کیلی فورنیا میں پائی جانے والی عجیب چھپکلی

حالاں کہ عام چھپکلیوں کو تم نے دیواروں پر گھومتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ باجا کے علاقے میں پائی جانے والی اس چھپکلی کے صرف دو پیر ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کچھ چھپکلیاں امریکا کے مشہور شہر نیویارک کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔

یہ چھپکلیاں عام طور پر تقریباً ۵ انچ لمبی ہوتی ہیں اور تقریباً ½ انچ موٹی ہوتی ہیں۔ ان کا رنگ مٹیالا یعنی بالکل مٹی کے رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ عام چھپکلی کا بدن اوپر سے بالکل چکنا ہوتا ہے، لیکن اس کا بدن بالکل جڑے ہوئے اسپرنگ کی طرح ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ کر کے پھر جوڑ دیے گئے ہوں۔ اسے اگر قریب سے دیکھا جائے تو اس کا سر پورے بدن سے علیحدہ دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اگر دور سے دیکھو تو صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا کہ سر کتنا بڑا ہے۔ البتہ قریب سے دیکھنے پر سر کے پچھلے حصّے سے ملے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے پیر بھی نظر آتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیں کہ اس کے صرف دو ہی پیر ہوتے ہیں، حالاں کہ عام چھپکلیاں تم نے چار پیروں والی دیکھی ہوں گی۔

بہت سی چھپکلیوں کے بدن ہماری گھریلو چھپکلی کی طرح چکنے ہوتے ہیں۔ اور بہت سی چھپکلیوں کے بدن پر نشانات بھی ہوتے ہیں۔

بہت سی چھپکلیوں کی نسلیں دنیا سے مٹ چکی ہیں اور بہت سی چھپکلیاں ختم ہوتی جا رہی ہیں، لیکن جس چھپکلی کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ چھپکلیوں کی اُن قسموں میں سے ہے، جس کے بدن کے بعض حصّے ختم ہو چکے ہیں، لیکن اس کی نسل ابھی تک باقی ہے۔ اس کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس کے اگلے پیر ابھی تک سلامت ہیں ورنہ چھپکلی کی دوسری اقسام کے اگلے پیر پہلے ختم ہوئے پھر اُن کے پچھلے پیر ختم ہوئے۔

یہ پیر ختم ہونے والی بات تمھیں ضرور عجیب سی لگی ہو گی، لیکن ہم تمھیں یہ بتا دیں کہ دنیا کے سائنس والوں کا خیال ہے کہ دنیا میں جس کسی چیز کی نسل ختم

ہوئی ہے، وہ اسی طرح ختم ہوئی ہے کہ پہلے اُس چیز کے بدن کے بعض حصّے ختم ہوئے، پھر رفتہ رفتہ وہ چیز ہی پیدا ہونا ختم ہو گئی۔ یہی حال اس چھپکلی کا ہے، جس کے متعلق تمھیں بتایا جارہا ہے اور شاید اسی لیے چھپکلیوں کی یہ نسل اب صرف امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے جزیرہ نما باجا کے جنوبی حصّے ہی میں پائی جاتی ہے۔

تم نے اس چھپکلی کے متعلق اتنا سب کچھ پڑھ لینے کے بعد یہ ضرور سوچا ہوگا کہ آخر اس چھپکلی کا نام کیا ہے؟ آخر اسے کسی نام سے تو پکارتے ہی ہوں گے۔ تو سنو! اس کا نام ہے "بائی پس بائی پورس"۔ اگر تم پوچھو کہ کیلی فورنیا کے لوگ اسے کس نام سے پکارتے ہیں، تو یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔ ہم نے جو نام تمھیں بتایا ہے، وہ نام تو سائنس کی زبان میں رکھا گیا ہے۔

ہم نے تمھیں پہلے ہی بتایا ہے کہ بائی پس پورس عام طور پر زمین کے نیچے رہتی ہے۔ زیادہ تر یہ گیلی اور نرم ریت ہی میں اپنی زندگی گزارتی ہے۔ جب کبھی کسی وجہ سے یہ زمین کے اوپر آجاتی ہے تو اپنے سر سے مٹی کو دھکیل کر اور بدن کے اعضا کو سکوڑ کر خود کو پھر ریت کے اندر کر لیتی ہے۔

---

## کتب خانے اور کتابیں

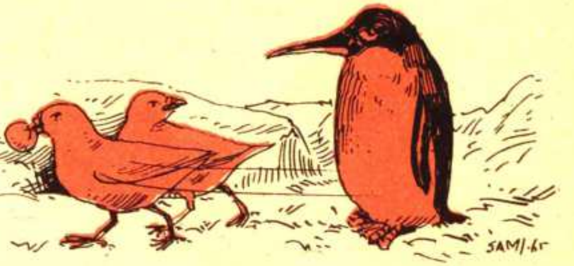
| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | لینن اسٹیٹ لائبریری | (ماسکو) | ایک کروڑ دس لاکھ کتابیں |
| ۲۔ | کانگریس لائبریری | (واشنگٹن) | چھیاسی لاکھ نوے ہزار کتابیں |
| ۳۔ | برٹش میوزیم | (لندن) | پچاس لاکھ کتابیں |
| ۴۔ | نیشنل لائبریری | (پیرس) | پچاس لاکھ کتابیں |
| ۵۔ | نیویارک پبلک لائبریری | (نیویارک) | پچپن لاکھ کتابیں |
| ۶۔ | ہارورڈ یونی ورسٹی لائبریری | (ہارورڈ) | پچاس لاکھ کتابیں |
| ۷۔ | نیشنل لائبریری | (فلورنس) | چونتیس لاکھ کتابیں |
| ۸۔ | اسٹیٹ لائبریری | (میونخ) | بیس لاکھ کتابیں |
| ۹۔ | امپیریل لائبریری | (کلکتہ) | پانچ لاکھ کتابیں |
| ۱۰۔ | پنجاب پبلک لائبریری | (لاہور) | تین لاکھ کتابیں |

# پین گوئن



یہ عجیب و غریب سمندری پرندہ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی بونا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اگر ان کے جھنڈ کو دور سے دیکھا جائے تو یہ ایک بونوں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ پین گوئن (PENGUIN) شمالی کرۂ ارض کا ایک خاص سمندری پرندہ ہے۔ یہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے پَیر ہوتے ہیں۔ پین گوئن عموماً ایک کے پیچھے ایک کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح فوج کے سپاہی چلتے ہیں۔ یہ عجیب طرح سے مٹک مٹک کر چلتے ہیں کہ دیکھنے والا اپنی ہنسی ضبط نہیں کرسکتا۔ ان کی ایک قسم کنگ پین گوئن (KING PENGUIN) کہلاتی ہے اور وہ بالکل انسان سے ملتی ہوئی اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ سر پر سیاہ بال ہوتے ہیں اور جسم پر بالکل کوٹ کی طرح سلیٹی اور سینے پر سفید بال ہوتے ہیں۔ بڑی پین گوئن، جو امپرر پین گوئن (EMPEROR PENGUIN) کہلاتی ہے، اس کی اونچائی ۳½ فیٹ اور وزن ۸۰ پونڈ ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ بالکل پرندوں





کی طرح اڑتی تھی، مگر اب اس کے پر بے کار ہوگئے ہیں اور وہ صرف پانی میں تیرنے کے لیے چپّو کا کام دیتے ہیں۔ عرصے تک اپنے پر استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ان کے پر بالکل غائب ہوگئے ہیں اور اب صرف نشان باقی ہے۔

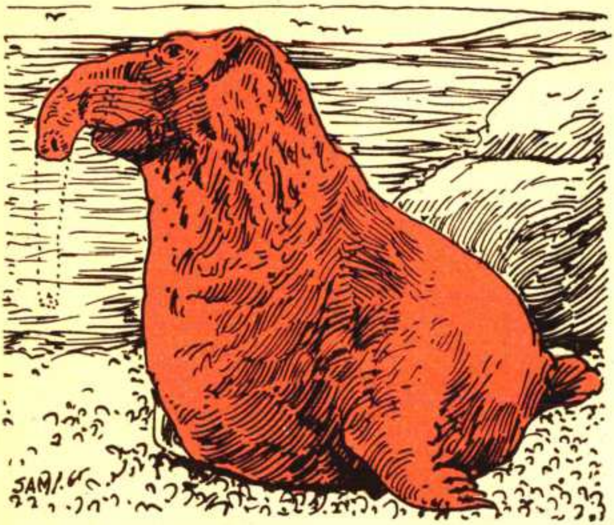
یہ پرندہ بڑا زبردست غوطہ خور اور پیراک ہوتا ہے۔ بحرالکاہل کے پہاڑی کنارے والے جزیروں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور شمالی امریکا کے حصّوں میں ان کی بستیاں پائی جاتی ہیں۔

یہ پرندے چوں کہ مچھلی کھاتے ہیں، اس لیے ان کے گوشت اور تیل میں اس کی بُو آتی ہے۔ ان کے انڈے بالکل چاک مٹی کی طرح سفید ہوتے ہیں اور اکثر ہلکے سبزی مائل بھی۔ ان پرندوں کو اگر چھیڑا جائے تو بُری طرح کاٹتے ہیں، مگر ویسے وہ انسان سے زیادہ ڈرتے نہیں ہیں۔

ان کے انڈے شیتھ بل نامی پرندہ چرا کرلے جاتا ہے۔ اس کا طریقہ بڑا دل چسپ ہوتا ہے۔ ایک پرندہ مادہ پین گوئن کو چھیڑتا ہے اور وہ جب اُسے مارنے دوڑتی ہے تو دوسرا شیتھ بل پرندہ اپنی نوکدار چونچ انڈے میں



مار کر اسے لے بھاگتا ہے اور غریب پین گوئن اس قدر سیدھی ہوتی ہے کہ کچھ نہیں کرپاتی۔




# سمندری ہاتھی

کپتان کُک نے اپنے سفرنامہ میں سمندری ہاتھی کا ذکر کیا ہے۔ در اصل سمندری ہاتھی، سیل (SEAL) کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ان میں سب سے بڑا سیل ہوتا ہے۔ نر کی لمبائی ۲۵ اور ۳۰ فیٹ تک ہوتی ہے۔ مادہ کی لمبائی کافی کم ہوتی ہے اور وہ مشکل سے ۱۰ فیٹ لمبی ہوتی ہے۔ سمندری ہاتھی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی ناک ہوتی ہے۔ یہ سونڈ نما چیز اس کے اوپر والے ہونٹ پر لگی رہتی ہے اور عام حالت میں کافی چھوٹی ہوتی ہے، مگر جب وہ غصّہ میں ہوتا ہے تو ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ زور زور سے سانس لینے لگتا ہے اور یہ سونڈ بڑھ کر ایک فٹ سے زیادہ لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کا حلیہ بالکل ہی بدل جاتا ہے اور وہ ہاتھی جیسی معلوم ہونے لگتی ہے۔

سمندری ہاتھی کی کھال کھردری، سلیٹی رنگ کی ہوتی ہے، اسی لیے وہ پسند نہیں کی جاتی۔ اس کا تیل بہت پسند کیا جاتا ہے جو کافی مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔ ایک سیل سے دو سو دس گیلن تیل نکلتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شمالی سمندروں میں سے

یہ غائب ہوتا جا رہا ہے، اس لیے کہ تیل کے لیے اس کا شکار زیادہ ہونے لگا ہے۔ کسی زمانے میں جزیرے فاکلینڈ اور شمالی جورجیا میں سفید ہاتھی کثرت سے پائے جاتے تھے۔ جب یہ کنارے کے پاس ہوتے ہیں تو یہ بہت کم اپنی جگہ سے ہلتے ہیں۔ عموماً کنارے کے پاس کسی سرسبز جگہ پر ان کے جھنڈ کے جھنڈ پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ریت میں گڑھے کھود لیتے ہیں اور اس میں آرام سے پڑے رہتے ہیں۔

یہ بہت آہستہ سانپ کی طرح رینگتے ہیں اور اپنے اگلے پیر نما حصّوں کی مدد سے چلتے ہیں، مگر سمندر میں یہ سمندری ہاتھی بڑی تیزی سے تیرتے ہیں۔

---

# کتّے کے کان بہت تیز ہوتے ہیں

کتّے اکثر اتنی باریک آواز سُن لیتے ہیں جو ہم نہیں سُن سکتے۔ اچھی نسل کے کتّے بیس فیٹ کے فاصلے پر گرنے والی سوئی کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اسی قوّت کے سہارے کتّے مشتبہ افراد پر بھونکنے لگتے ہیں۔

رات کے سناٹے میں اگر چلنے والے کے قدموں کی چاپ معمول پر ہے تو کتّے اس پر نہیں چونکتے، لیکن اگر قدموں کی چاپ میں ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار ہوا یا ان کی رفتار میں فرق پڑا تو کتّے فوراً چوکس ہو جاتے ہیں اور بھونکنے لگتے ہیں۔

---



# شیکسپیئر کا بچپن

(سحر انصاری)

پچھلے دنوں بڑی دھوم دھام سے ساری دنیا میں ولیم شیکسپیئر کی چار سو سالہ سال گرہ منائی گئی۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں شاعری اور فکر کی جو بلندی پائی جاتی ہے، اس کی نظیر دنیا کے ادب میں اب شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کا دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کی فکر اور شاعری نے دنیا کے اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ حضرات کو متاثر کیا ہے۔ شیکسپیئر کی زندگی کے بارے میں بہت کم تفصیلات ملتی ہیں، پھر بھی کھوج لگانے والوں نے اس کے بچپن، جوانی اور آخری عمر کے حالات بڑی کوششوں اور محنت کے بعد جمع کر ہی لیے ہیں۔

انگلستان کے ضلع وارو کشائر میں ایک قصبہ اسٹریٹ فورڈ اپان ایون ہے۔ یہ قصبہ دنیا میں مشہور ہے، کیوں کہ ولیم شیکسپیئر ۱۵۶۴ء میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد جان شیکسپیئر دستانے بناتے اور چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ولیم شیکسپیئر کی دو بہنیں مختلف امراض میں پہلے ہی مر چکی تھیں، اس لیے جب شیکسپیئر تین ماہ کا ہوا تو اسے وباؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک اور گاؤں میں منتقل کر دیا گیا۔ ولیم شیکسپیئر کے والدین کی اس دانش مندی نے اس بچے کو اس ہیبت ناک وبا سے محفوظ کر لیا، جس نے صرف چھے ماہ کے اندر اسٹریٹ فورڈ کی دو ہزار کی آبادی میں سے دو سو

ستاون ۲۵۶ افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ بچہ اگر اس وبا سے محفوظ نہ رہ جاتا تو دنیا اس عظیم شاعر اور ڈراما نویس سے محروم ہو جاتی۔

اسٹریٹ فورڈ کے گرامر اسکول میں طلبا کی حاضری کا کوئی ایسا رجسٹر موجود نہیں ہے، جس سے پتہ چل سکے کہ شیکسپیئر نے اس اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن چوں کہ اس علاقے میں اس کے علاوہ کوئی اور اسکول تھا ہی نہیں، اس لیے شیکسپیئر کے سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ شیکسپیئر نے یقیناً اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔

اس زمانے میں طلبا کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ گرمیوں کے زمانے میں صبح چھے بجے اور سردی کے موسم میں صبح سات بجے انھیں اسکول پہنچ جانا پڑتا تھا۔ پڑھائی صبح نو بجے تک جاری رہتی تھی، پھر اس کے بعد گیارہ بجے تک مختلف کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، پھر کھانے کے وقفے کے بعد شام کے پانچ بجے تک پڑھائی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ولیم شیکسپیئر کو بچپن میں یہ دن بڑا کٹھن معلوم ہوتا ہوگا، شاید اِسی لیے وقت کے آہستہ آہستہ رینگنے کے احساس کو شیکسپیئر نے اپنے کئی ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر "ایز یُو لائک اِٹ" (AS YOU LIKE IT) کے ایکٹ ۲، منظر ۷ میں جیکوئس کی زبانی یہ مکالمہ "اسکول کی طرف دل برداشتہ گھونگھے کی مانند رینگتے ہوئے"۔

انگریزی زبان کی ابتدائی کتابیں حساب، للی کی گرامر اور لاطینی زبان انھوں نے اسی اسکول میں سیکھی تھی۔ سبق یاد نہ ہونے یا اکتا دینے والے طویل گھنٹوں میں اِدھر اُدھر دھیان بٹ جانے پر اس وقت کے استاد بہت زور سے کان کھینچتے اور جھٹکتے تھے۔ ممکن ہے بچپن میں شیکسپیئر کو بھی اس سزا سے گزرنا پڑا ہو۔

چھٹیوں کے دنوں میں شیکسپیئر کا وقت بڑی آزادی اور سکون کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس زمانے میں وارو کشائر کے جنگلوں اور جھاڑیوں میں گھومتے

پھرتے تھے۔ چڑیوں ، درختوں، گلہریوں، پھولوں اور پھلوں کو غور سے دیکھتے اور دریائے ایون کے کنارے آبی پرندوں اور دھوپ اور چھاؤں کی آنکھ مچولی کا منظر بڑی دل چسپی سے دیکھتے رہتے تھے۔

گاؤں کے اکثر مناظر انھیں بہت پسند آتے تھے۔ وہ پہروں ایک ایک چیز کو دیکھتے اور اس میں کھو جاتے تھے۔ باغوں کی کھلی فضا اور دریائے ایون سے ہوکر آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا میں ان کے ذہن کے دریچے کھلنے لگے اور فطرت کے یہی حسین مناظر اور ان کی دل کشی نے شیکسپیئر کو ایک بلند خیال شاعر بنا دیا۔ شاعری کی ابتدا اسی ماحول میں ہوئی۔

ولیم شیکسپیئر کی زندگی کا اہم موڑ اس وقت آیا جب انھوں نے اِسٹریٹ فورڈ میں آنے والے ایک ڈراما کمپنی کے ڈرامے دیکھے اور اس کے اداکاروں سے ملاقات کی۔ یہ اداکار اور یہ ڈرامے انھیں اتنے پسند آئے کہ سب کچھ چھوڑ کر انھوں نے اداکاری شروع کردی اور ہر وقت اسی دُھن میں رہنے لگے۔

۱۵۸۶ء میں انھوں نے اسکول چھوڑ دیا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لندن چلے آئے۔ یہاں انھوں نے مختلف کام کر کے روزی حاصل کی، لیکن زیادہ تر توجّہ ایکٹر بننے پر صَرف کرتے رہے۔ بعض تحقیقات سے معلوم ہوا کہ شیکسپیئر نے اسٹریٹ فورڈ سے لندن کا سفر پیدل طے کیا تھا۔ اسی لگن اور شوق نے انھیں لندن کا ایک کام یاب ایکٹر بنا دیا تھا۔

دوسرے بچّوں کی طرح شیکسپیئر بھی شرارت کے عادی تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اپنے ہم سِنوں کے ساتھ ایک باغ میں جا رہے تھے کہ انھیں چند ہرن نظر آئے۔ شیکسپیئر نے چپکے سے ایک پالتو ہرن کو پکڑ لیا۔ باغ کے مالک نے اس پر شور مچا دیا اور انھیں پکڑ لیا۔ شیکسپیئر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کام یاب ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کی شرارت کا کوئی واقعہ نہیں معلوم۔

بچپن کا زمانہ گزر جانے کے بعد شیکسپیئر کی ذہانت اور صلاحیت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوئی۔ کچھ عرصے اداکاری کرنے کے بعد انھوں نے خود ہی ڈرامے لکھنے شروع کر دیے۔ اور انھی ڈراموں کی بدولت دنیا کے عظیم شاعر اور ڈراما نگار بن گئے۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں میں "مرچنٹ آف وینس"، "ہیملٹ"، "رومیو جولیٹ"، "ایز یو لائک اِٹ"، "اوتھیلو"، "کنگ لیئر"، "میکبتھ" اور "ٹوئلفتھ نائٹ" وغیرہ شامل ہیں۔

---

# دنیا کا سب سے بڑا محرابی پُل کہاں ہے؟

سکھر اور روہڑی کو ملانے والا ایوب بیراج پورے ملک میں اپنی طرز کا واحد محرابی پل ہے۔ بغیر ستون کے سہارے یہ پل محراب کی شکل سے تنے ہوئے آہنی جال کے سہارے کھڑا ہے۔ اس طرز کا سب سے بڑا پُل سڈنی کی بندرگاہ پر ہے۔ یہ پل بندرگاہ کے اوپر ۱۶۵۰ فیٹ کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے اس کی اونچائی ۴۴۰ فیٹ ہے اور اصل محراب کا وزن چالیس ہزار ٹن ہے۔

محراب میں ایک ۵۷ فیٹ چوڑی سڑک ہے۔ چار راستے ریلوں کے لیے ہیں۔ دس دس فیٹ چوڑی دو طرفہ فٹ پاتھ ہیں اس طرح پُل کی چوڑائی ۱۶۰ فیٹ ہو جاتی ہے۔ پانی کی سطح سے پُل کی اونچائی ۱۷۰ فیٹ ہے۔

...



# میں وہ چھٹی کبھی نہیں بھولوں گا

## ایک پندرہ سالہ لڑکے کی آپ بیتی

عطاء الرحمٰن صدیقی

جب میں نے اپنے ایپے ملٹن کے اسکول پر آخری نظر ڈالی تو سخت سردی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، مگر گھر پر کرسمس کی چھٹیاں گزارنے اور والدین سے ملنے کی خوشی میں قطعی پروا نہیں کی۔ ہمارا گھر مینڈریا میں تھا، جہاں میرے والد کا ہوٹل بھی تھا اور ہر وقت دھوپ نکلی رہتی تھی۔ میں لندن کے لیے ریل میں سوار ہوا اور واٹرلو کے اسٹیشن پر مجھے میری دادی اماں گرینی بھی مل گئیں۔ لندن سے ساؤتھمپٹن تک ہم موٹر بوٹ میں گئے اور ۱۹ دسمبر کو وہاں سے ایک جہاز لکونیا میں مینڈریا کے لیے سوار ہوئے۔ اتوار کی رات کو جب ہمیں جہاز میں سفر کرتے ہوئے چار روز ہو گئے تھے تو دادی گرینی نے مجھ سے کہا، "کل صبح ہمارا جہاز مینڈریا پہنچ جائے گا، تم جلدی سو جاؤ، تاکہ اس وقت تک تمھاری نیند پوری ہو جائے،" مگر اُس رات کو بوب ہوپ کی ایک فلم "کال می بُوانا" دکھائی جا رہی تھی، میں ان سے آنکھ بچا کر فلم دیکھنے کے لیے کھسک گیا۔ عین اُس وقت جب بوب ہوپ کو راکٹ میں بٹھا کر چاند پر بھیجا جا رہا تھا، مدھم آواز سے گھنٹیاں بجنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ فلم ہی میں بج رہی ہیں، لیکن گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں اور آواز بھی تیز ہوتی گئی۔

تماشائیوں میں بھی کچھ بے چینی کے آثار محسوس ہوئے اچانک ہی تیزی سے دروازے کھلنا شروع ہوئے۔ معلوم ہوا جہاز میں آگ لگ گئی۔ ہال میں کھلبلی مچ گئی اور ایک تنگ راستے سے لوگوں نے باہر نکلنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہا۔ ایک زوردار ریلے نے مجھے بھی ہال سے نکال کر اس تنگ راستے میں دھکیل دیا۔ دھوئیں سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ سانس لینا مشکل تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں جب کولا کی مشین کے نزدیک پہنچا تو میں نے ایک خالی بوتل کھڑکی کے شیشے پر دے ماری۔ شیشہ ٹوٹتے ہی تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور گھٹن کچھ کم ہوئی۔

دھوئیں سے بچنے کے لیے منھ اور ناک پر رومال لپیٹ لیا اور اپنے کیبن کی طرف دوڑا کیبن میں داخل ہوتے ہی میز پر ایک نارنگی نظر آئی وہ تو اٹھا کر جیب میں ڈال لی، مگر جب دادی گرینی کا خیال آیا تو روپیہ پیسہ سامان اور کپڑے وغیرہ سب کیبن میں چھوڑے اور دادی گرینی کے کیبن کی طرف جو میرے کیبن کے برابر ہی تھا دوڑا، لیکن یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ وہ اپنے کیبن سے غائب ہیں۔ فوراً عرشے پر پہنچا وہاں اس قدر بھیڑ اور دھکا پیل ہو رہی تھی کہ میں بمشکل اپنے حواس پر قابو پا سکا۔ اسی افراتفری کی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر دادی گرینی کو آوازیں دینے لگا، لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھیں۔ انھیں تلاش کر ہی رہا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی، "سب کھانے کے کمرے میں پہنچ جاؤ"۔ میں نے دل میں کہا کہ شعلوں کی لپٹ اور گہرے دھوئیں کے بادلوں میں ایک بند جگہ جانے کی کیا تک ہے، لیکن یہ کپتان کا حکم تھا، اس لیے سب کا رُخ اُدھر ہو گیا۔ بھیڑوں کے گلے کی آخری بھیڑ کی طرح میں بھی لکیر کا فقیر بننے پر مجبور تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر دادی گرینی پر پڑی۔ وہ ایک دیوار سے چپکی کھڑی تھیں۔ ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ دھوئیں کے زہریلے بادلوں اور آگ کی تپش سے سانس لینا دشوار تھا اور چربی پگھلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک اور آواز آئی "سب حفاظتی کشتیوں کے پاس پہنچ جاؤ"!

اور یہ بے ترتیب خوف زدہ مجمع سراسیمگی کی حالت میں اندھا دھند کشتیوں کی طرف دوڑا۔ اس جھیلے میں دادی گرینی پھر میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ جب میں حفاظتی کشتی نمبر ۷ کے قریب پہنچا تو میری نظر اُن پر پڑ گئی۔ وہ ایک کشتی کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ میں نے انھیں آواز دے کر ہاتھ کے اشاروں سے بُلایا، تاکہ وہ بھی میری کشتی پر آ جائیں۔ پہلے کشتیاں سمندر میں اُتاری گئیں پھر مسافروں کو ان میں چھلانگ لگانے کا حکم ملا۔ کشتیوں میں اترنے کے لیے کوئی سیڑھی نہیں تھی، بلکہ لوہے کی ایک موٹی سلاخ کے ذریعے کشتی میں چھلانگ لگانی تھی سخت سردی، ناقابلِ برداشت ہوا، اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے، ضعیف، کمزور بچّے اور خوف زدہ عورتیں، جسموں پر لرزہ طاری تھا، ہوش و حواس گم اور جان بچانے کے لیے ایک دوسرے سے پہلے کشتی میں پہنچنے کی کوشش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے سے زیادہ آدمی سمندر میں گر گئے۔ سب کے پاس حفاظتی پیٹیاں بھی نہیں تھیں۔ گرنے والوں کی آہ وزاری اور چیخ و پکار سے دل لرز رہے تھے میرے لیے تو چھلانگ لگانی مشکل نہ تھی، لیکن دادی گرینی کے لیے جن کی عمر ستّر سال تھی اور بال بالکل سفید تھے قطعی ناممکن تھا۔ ایک ملّاح کی مدد سے انھیں کشتی میں اتارنے کی کوشش کی۔ میں ہاتھوں کے سہارے ان کے ساتھ چلتا رہا۔ کشتی میں جو مسافر ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے انھوں نے کشتی کو جہاز کے قریب لانے کی کوشش کی، لیکن لوہے کا وہ ٹکڑا جو کشتی کو جہاز سے علیحدہ رکھنے کے لیے جو جہاز میں مضبوطی سے ٹھونک دیا گیا تھا، کشتی کو جہاز کے نزدیک نہیں آنے دیتا تھا۔ میں اس خوف سے کانپ رہا تھا کہ اگر ذرا بھی میری گرفت لوہے کے ڈنڈے پر کمزور پڑی تو میں اور دادی گرینی یقیناً سمندر میں غرق ہو جائیں گے۔ کشتی کو نزدیک لانے کی ہر چند کوشش کی گئی، لیکن وہ لوہے کا ڈنڈا بیچ میں حائل رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں سردی اور خوف سے کانپ رہے تھے۔ دادی گرینی

فریب قریب بے ہوش تھیں کہ خوش قسمتی سے ایک شخص لوہے کے ڈنڈے سے کشتی کو علیحدہ کرنے میں کام یاب ہوگیا اور کشتی جہاز کے ساتھ لگ گئی، اب دادی گرینی کشتی سے تھوڑی سی بلند تھیں، لیکن مسافروں نے سہارا دے کر انھیں اتار لیا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ عرشے سے جہاز کا عملہ ان لوگوں کے سہارے کے لیے جو سمندر میں بغیر حفاظتی پیٹیوں کے گر گئے تھے، میزیں کرسیاں اسٹول، بنچ وغیرہ پھینک رہا تھا۔ ہمیں یہ ڈر تھا کہ ہماری کشتی میں گر کر ہمیں زخمی نہ کر دیں۔ اس کے علاوہ ہماری کشتی جہاز کے اس نل کے قریب تھی، جس کے ذریعہ جہاز سے پانی خارج کیا جاتا ہے اور ہماری سب سے زیادہ گھبراہٹ اور بے چینی کا سبب یہ بھی تھا کہ کشتی جلتے ہوئے جہاز کے ساتھ لگی ہوئی تھی، ہم انتہائی کوشش کر رہے تھے کہ کشتی کو جہاز سے دور لے جائیں، لیکن لہروں کے مقابلہ میں ہمارا بس نہ چلتا تھا۔ جہاز سے آواز آئی کہ آگ تیل کے ٹینک کے نزدیک پہنچ گئی ہے، کشتی جلد ہٹاؤ، کہیں شعلوں کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ ہم نے سخت جدوجہد شروع کر دی۔ خدا کا شکر ادا کیا جب ایک زبردست لہر نے ہماری کشتی کو جہاز سے بیس۲۰ فیٹ دُور دھکیل دیا۔ اب بھی عرشے سے آوازیں آرہی تھیں، "کشتیوں کو سیدھا کرو اور قطار میں رکھو۔" ہر شخص مختلف سمت میں کشتی لے جا رہا تھا۔ جب میں نے شور مچایا اور کشتیوں کو سیدھا کرنے کو کہا تو مجھے ایک شخص کی آواز آئی جو چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکا ہے، اس کی بات پر دھیان نہ دو، لیکن چند آدمیوں کے سمجھ میں آگیا اور کشتیوں کا رُخ سیدھا کر لیا۔

جہاز شعلے اگلتا ہوا آتش فشاں پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ اب بھی کچھ آدمی عرشے پر کھڑے ہیں اور لاتعداد لاشیں عرشے پر تیر رہی ہیں۔ خدا معلوم کتنے زندہ تھے اور کتنے مردہ اب چاروں طرف جہاز سے اڑ کر آگ پھیل رہی تھی۔ ہماری کشتی میں ایک بہت بہادر عورت تھی جو سب کا دل بڑھاتی رہی۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کتنی دیر کشتی میں رہے کہ دور سے روشنی نظر آئی اور ایک گھنٹے کے بعد ایک امدادی جہاز ہمارے قریب پہنچ گیا۔ جہاز کے عملے نے ہمیں اوپر کھینچنے کے لیے رسے لٹکا دیے۔ پہلے چھوٹے بچوں کو کھینچا گیا، پھر عورتوں کو۔ میری باری سب سے آخر میں آئی۔ مجھے فخر تھا کہ میں بڑوں میں شمار کیا گیا۔ اس طرح تقریباً تین سو آدمی جہاز میں پہنچ گئے اس جہاز کا نام "مونٹ کام" تھا، جو کنیڈا سے کاسابلانکا جا رہا تھا۔ جہاز کے عملے نے ہمارے ساتھ بے حد ہمدردی کا برتاؤ کیا۔ ہمیں سونے کے لیے تختے اور کمبل دیے۔ میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ گرم گرم چائے دی اور سونے کے لیے کلاس سوئم کے انجینئر کے کیبن میں جگہ دی، مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں ہوائی جہازوں کی آوازیں سن کر عرشے پر آ گیا۔ سمندر آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ کچھ تیر رہے تھے، کچھ فرنیچر کا سہارا لیے ہوئے تھے، کچھ بے ہوش تھے۔ ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہے تھے۔ "مونٹ کام" کی کشتیاں بھی آدمیوں کو نکال رہی تھیں۔ ملاح لاشوں کو کشتیوں میں ڈال رہے تھے مجھے بھی آدمیوں کی جان بچانے کے انعام میں تمغہ ملا۔ میں نے ایک آدمی کو بچانے کی بیس منٹ تک جد و جہد کی لیکن وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ دوسرا آدمی مدد کے لیے چیخ رہا تھا، اسے پندرہ منٹ کی کوشش میں کشتی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اُسے جہاز پر چڑھایا گیا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اُس نے ایک کھڑکی کے شیشے کو توڑنا چاہا وہ اپنے خیال کے مطابق ابھی لکونیا ہی میں تھا۔ جہاز کے عملے نے اس کو سونے کے تختے سے باندھ دیا۔

میں جہاز کے باورچی خانے میں گیا تو دیکھا وہاں کھانا لینے والوں کا ایک ہجوم ہے اور خانساماں گھبرایا ہوا ہے، کیوں کہ وہ اکیلا اتنے آدمیوں کو نہیں نمٹا سکتا تھا، اُس نے مجھ سے مدد کے لیے کہا۔ پہلے میں نے روٹیوں پر مکھن لگایا، پھر پیالے اور پلیٹیں دھوئیں۔ آٹھ گھنٹے تک مسلسل خانساماں کے ساتھ کام کرتا رہا اور تھک کر چور ہو گیا۔ خانساماں

نے مجھے کمبل میں لپیٹ دیا اور سلانے کے لیے اُسے باورچی خانے میں جب کوئی جگہ نہ ملی تو ایک نہانے کے خالی ٹپ میں لٹا دیا اور جب تک کاسابلانکا کی بندرگاہ نہیں آگئی میں سوتا رہا۔

بندرگاہ پر جہاں تک میری نظر جاتی تھی ایمبولنس، نرسیں، ڈاکٹر اور بے شمار آدمی کمبل، خوراک اور کپڑے وغیرہ لیے ہوئے ہمارے منتظر تھے۔ جہاز کے ٹھہرتے ہی ایک سخت ریلا آیا، عرشہ اور تمام کیبنیں آدمیوں سے بھر گئے۔ ایک اخبار کا نمائندہ مائکروفون لے کر میرے پاس آیا۔ مگر میں اسے کوئی بات نہ بتا سکا۔ کاسابلانکا پہنچ کر دادی گرینی نے مینیڈریا جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس انگلینڈ چلی گئیں۔ ان کے پاس نہ کوئی کپڑا باقی رہا تھا نہ پیسہ۔ انھوں نے مجھے الوداع کہا اور رخصت ہوگئیں۔ میں تین دن کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعہ لزبن پہنچا اور وہاں سے میرے دوستوں نے مجھے ایک جہاز میں مینیڈریا کے لیے سوار کرا دیا۔

مینیڈریا پہنچ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، لیکن جب میں نے اپنے والدین اور چھوٹے بھائی مارک کے چہروں کو دیکھا تو میرے آنسو نکل گئے۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے اور دادی گرینی سے بالکل نا امید ہو چکے تھے۔ انہوں نے امدادی جہازوں کو ریڈیو گرام بھیجے، لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ ہمارے جہاز کی تباہی کے متعلق انھیں پیر کی صبح کو اطلاع ملی تھی۔ دادی گرینی نے بھی مونٹ کام کے آپریٹر کو ان کے لیے ایک پیغام دیا تھا، مگر وہ انھیں نہیں ملا۔ منگل کے روز صبح چھے بجے کرسمس سے ایک روز پہلے تک کوئی جہاز مینیڈریا کی بندرگاہ پر نہیں آیا مارک نے مجھے بتایا کہ ہم قطعی یقین کر چکے تھے کہ تم اس حادثے کی نظر ہو گئے ہو کہ اچانک کرسمس کی رات کو ڈیڑھ بجے جب والدین دعا میں مشغول تھے، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور دادی گرینی کا پیغام کاسابلانکا سے آیا کہ ہم محفوظ ہیں۔ میں اُس وقت نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ ممی نے مجھے بتایا بھی، لیکن میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ کرسمس کی صبح کو جب دوبارہ مجھ سے ممی نے دادی گرینی

کا پیغام سنایا تو اطمینان ہوا۔
میں دریافت کرنے والوں کو واقعات سنا رہا تھا۔ میری خواہش تھی جو کچھ مجھ پر بیتی ہے سب اگل دوں، لیکن مارک نے مجھے منع کر دیا اور کہا بہتر ہے تم سیر کو باہر چلے جاؤ ورنہ جب تک اسکول واپس پہنچوگے، اس وقت تک اس دل خراش داستان کو ختم نہیں کر سکوگے۔ مارک صرف بارہ[12] سال کا لڑکا ہے، مگر بہت ذہین ہے مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔
میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں، اس لیے نہیں کہ زندہ ہوں، بلکہ اس لیے کہ میرے والدین میری زندگی سے ناامید ہونیکے باوجود بھی میری سلامتی کے لیے دعا کرتے رہے اور یہ انہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اس حادثے سے بچ گیا۔

---

ماں : (غصّے سے) میں تمھیں کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ شور نہ کیا کرو۔

بیٹا : (کچھ سوچ کر) دس مرتبہ۔

## کیا تمھیں معلوم ہے؟

- چیونٹیاں کئی بار اپنے ننھے منے پاؤں کی مدد سے سونگھتی ہیں۔ اور چلتے ہوئے ایک دوسرے سے ہم گفتگو ہوتی ہیں۔
- انگریزی کوئل دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتی ہے۔
- مرنے کے بعد انسان کا دماغ دس منٹ، آنکھیں تین منٹ، کان ایک گھنٹہ، ٹانگیں چار گھنٹے اور ہڈیاں تین دن زندہ رہتی ہیں اور اس کے بعد وہ مردہ ہوجاتی ہیں۔
- مینڈک اپنے منہ کے راستے سے پانی نہیں پیتا، بلکہ اس کے جسم میں جو چھوٹے چھوٹے اور باریک مسام ہوتے ہیں ان میں سے پانی آہستہ آہستہ جسم کے اندرونی حصّے میں خود ہی داخل ہوجاتا ہے۔
- ٹائپ رائٹر ۱۸۸۵ء میں ایم فوکالٹ نے تیار کیا تھا۔
- ایکس رے پروفیسر مانگٹن نے ۱۸۹۵ء میں ایجاد کیا۔
- کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے جسم میں ۱۰ گیلن پانی ہے۔ (فرحت سعید بٹ بجی)



# محمّد علی کلے

محمد عبید اللہ شریف

۲۵ مئی ۱۹۶۵ء کی رات یادگار رات ہے۔ کیشیس کلے نے اس رات لیوسٹن میں باکسنگ کے مقابلے میں سونی لسٹن کو شکست دے دی۔ اس مقابلے میں کُل ایک منٹ لگا ہوگا، اس طرح کلے نے ہیوی ویٹ کے عالمی چیمپین کا اعزاز دوبارہ حاصل کرلیا۔ اور پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

محمد علی کلے (کیشیس کلے) نے ۱۵ سال کی عمر میں باکسنگ کی مشق شروع کی تھی۔ انھیں لائٹ ہیوی ویٹ کا اولمپک گولڈ میڈل ۱۹۶۰ء میں دیا گیا۔ میڈل حاصل کرنے کے بعد وہ پیشہ ور باکسر بن گئے اور باکسنگ کے (۱۹) مقابلوں میں اپنے حریفوں کو شکست دے چکے ہیں۔

محمد علی کلے ۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو لوزویل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کیشیس کلے ایک کمرشیل آرٹسٹ ہیں۔ وہ انھیں بہت چاہتے ہیں۔ محمد علی کلے کے چھوٹے بھائی والنٹینو کلے بھی باکسنگ کو اپنا پیشہ بنانا چاہتے ہیں۔ محمد علی کلے بہت ہی ذہین اور بذلہ سنج ہیں۔

محمد علی کلے نے لوزویل کے سنٹرل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں دوستوں نے انھیں راک فائبر اور بائیسکل چیمپین کا خطاب دے دیا تھا۔

ایک دفعہ کسی نے محمد علی کلے کی بائیسکل چرا لی۔ چوری کی اطلاع دینے کے لیے جب لوزویل کے پولیس افسر کے پاس پہنچے تو پولیس افسر مارٹن نے (جو کمیونٹی جمنازیم میں باکسنگ کی تعلیم دیا کرتے تھے) محمد علی کلے کو دیکھتے ہی اندازہ لگایا کہ یہ ایک بہترین باکسر بن سکتے ہیں۔ چناں چہ مارٹن نے انھیں جمنازیم آنے کی دعوت دے دی۔

اس طرح محمد علی کلے کو ایک ایسا استاد مل گیا جس کا دعوا ہے کہ اس نے پچھلے بیس سال میں دس ہزار سے زیادہ نوجوانوں کو باکسر بنایا ہے۔

محمد علی کلے کو ۱۵ سال کی عمر میں دل کا عارضہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ بہترین علاج اور مکمل آرام کی وجہ سے صحت یاب ہو گئے تھے، باکسنگ کی چھے ہفتے کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے "چیمپین آف ٹومارو" کے ٹیلی ویژن پروگرام میں حصہ لیا۔ اس مقابلے کی بے حد ستائش کی گئی۔

پیشہ ور باکسر بننے سے پہلے انھوں نے (۱۰۸) دوستانہ مقابلوں میں حصہ لیا اور ایک سو مقابلے جیتے۔ انھیں چھے مرتبہ گولڈن گلو کا اعزاز بھی ملا۔ محمد علی کلے ایک امریکن نیگرو ہیں۔ انھوں نے چند سال پہلے اسلام قبول کیا۔ یہ ۱۹۵۹ء میں نیشنل گولڈن گلو کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا وزن ۱۴ اسٹون ۱۰ پونڈ ہے۔

محمد علی کلے کے متعلق اتنا معلوم ہو جانے کے بعد باکسنگ کے گزشتہ ریکارڈ پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے، جو درج ذیل ہے۔ یہ ریکارڈ مقابلہ ختم ہونے کے وقت کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

کیشیئس کلے (محمد علی کلے) نے سونی لسٹن کو ۲۵ رمئی ۱۹۶۵ء بمقام لیوسٹن ایک منٹ میں ہرایا۔

ٹامی برنس نے جم روچے کو، ۱۷ مارچ ۱۹۰۸ء بمقام ڈبلن ایک منٹ ۲۸ سیکنڈ میں شکست دے دی۔

جو لوئس ماکس نے اسکیملنگ کو ۲۲ر جون ۱۹۵۸ء بمقام نیویارک دو منٹ چار سیکنڈ میں ناک آوٹ کیا۔

سونی لسٹن نے فلوئڈ پٹرسن کو ۲۵ر ستمبر ۱۹۶۲ء بمقام شکاگو دو منٹ چھ سیکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے ٹمی موریلو کو ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۶ء بمقام نیو یارک دو منٹ ۹ سیکنڈ میں ہرایا۔

ٹامی برنس نے بل اسکوٹرس کو ۴ر جولائی ۱۹۰۷ء بمقام کلیفورنیا دو منٹ نو سیکنڈ میں ناک آوٹ کیا۔

سونی لسٹن نے فلوئڈ پٹرسن کو ۲۲ر جولائی ۱۹۶۳ء بمقام لاؤس لگاس (نوادا) دو منٹ دس سیکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے جیاک روپر کو ۱۷ر اپریل ۱۹۳۹ء بمقام لاس انجلس (کلیفورنیا) دو منٹ بیس سیکنڈ میں شکست دی۔

راکی مرسینو نے جرسی جو والکاٹ کو ۱۵ر مئی ۱۹۵۵ء بمقام شکاگو دو منٹ ۲۵ سیکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے جان ہنری لیوس کو ۲۵ر جنوری ۱۹۳۹ء بمقام نیویارک دو منٹ ۲۹ سیکنڈ میں ہرایا۔

جو لوئس نے بڈی بیر کو ۹ر جنوری ۱۹۴۲ء بمقام نیویارک دو منٹ ۵۶ سیکنڈ میں ہرایا۔

جیمس جیفری نے جیاک فنی گن کو ۶ر اپریل ۱۹۰۰ء بمقام ڈیٹریاٹ مشیگن ایک راؤنڈ میں ناک آوٹ کیا لیکن وقت نہیں ریکارڈ کیا گیا۔

## ہمسائی کی ناک

ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ بہت مزے دار سالن کھا رہا ہے۔ اچانک ہمسائے کے ایک بچّے نے آکر دروازے پر دستک دی، چناں چہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

بچّے نے اندر آکر اس شخص کی بیوی سے کہا کہ ہماری امی نے کہا ہے کہ تھوڑا سا سالن دے دیجیے۔

اس شخص نے بچّے کی یہ بات سنی تو حیران ہوکر بولا، ”اللہ اللہ ہماری ہمسائی نے کیا خوب ناک پائی ہے کہ پڑوسیوں کے خواب تک سونگھ لیتی ہے۔“

# آہ بے چارہ ریچھ

محمد احمد سعید

وہ منھ لٹکائے کمرے میں داخل ہوا اُس کا چہرہ اداس اور پژمردہ تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ساجد! تم اداس اور خاموش کیوں ہو، کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟" میں نے اس سے کہا،

"نہیں مجھے نوکری سے جواب مل گیا ہے"۔ اس نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے اونچی آواز میں پوچھا مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں مجھے نوکری سے جواب مل گیا ہے۔ میرا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا، لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا،

"میں بے کاری سے تنگ آگیا تھا۔ مجھے کہیں بھی ملازمت نہ ملتی تھی۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ تم چڑیا گھر چلے جاؤ اور وہاں میرا نام لے کر کہنا کہ مجھے ملازمت چاہیے، یہ آج سے چھے ماہ پہلے کی بات ہے، دوسرے روز میں چڑیا گھر روانہ ہو گیا اور مینیجر کے کمرے میں پہنچا۔ دوست کا نام لے کر میں نے اس سے کہا، "میں عرصے سے بے کار ہوں۔ اگر آپ کے پاس جگہ ہو تو مجھے ملازم رکھ لیں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

مینیجر نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، "تمھیں ملازمت مل جائے گی، لیکن کام ذرا مشکل ہے۔ شاید تم نہ کر سکو۔"

"میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔"

"تمھیں ریچھ بننا پڑے گا۔"

"ریچھ" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں تمھیں ریچھ کی کھال پہن کر پنجرے میں چڑیا گھر کھلنے سے بند ہونے تک رہنا پڑے گا اور اس

کا معاوضہ، تمھیں روزانہ پانچ رُپے کے حساب سے مل جایا کرے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا، یہ کام تو بہت آسان ہے۔

منیجر نے مجھے دوسرے روز آنے کو کہا۔

اور پھر میں چڑیا گھر میں ملازم ہو گیا۔ روزانہ صبح سات بجے میں چڑیا گھر پہنچ جاتا اور ریچھ کی کھال پہن کر پنجرے میں بیٹھ جاتا۔ لوگ آتے، مجھے ریچھ سمجھ کر دیکھتے۔ بچّے میرے پنجرے میں طرح طرح کی چیزیں پھینکتے۔ میں لوگوں کی نظریں بچا کر سب کچھ کھا جاتا۔ دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔ چند کھلنڈرے لڑکے روزانہ ہی چڑیا گھر آجاتے۔ مجھ پر کنکر پھینکتے اور تنگ کرتے، لیکن میں چپ چاپ پڑا رہتا۔

اُنھوں نے منیجر سے شکایت کر دی۔

"منیجر صاحب، آپ کا ریچھ چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔ بے چارا بیمار ہو گیا ہے۔ اس کا علاج کراؤ۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔"

چڑیا گھر بند ہوتے ہی میں کھال اتار کر اپنی مزدوری منیجر کے کمرے میں لینے گیا۔

وہ مجھے دیکھتے برس پڑا

"کم بخت! سارا دن پنجرے میں مُردوں کی طرح پڑے رہتے ہو۔ کچھ اچھلا کودا بھی کرو، لوگ تمھاری بہت شکایت کرتے ہیں، کہتے ہیں تمھارا ریچھ بیمار ہو گیا ہے۔ اگر تم کل بھی اسی طرح پڑے رہے تو سمجھ لو کہ تمھاری چھٹی۔"

منیجر کی ڈانٹ سن کر میں چپ چاپ گھر چلا آیا۔ ساری رات سوچتا رہا کہ میں لوگوں کو کس طرح خوش کر سکتا ہوں۔ رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔

دوسرے روز جب لوگ چڑیا گھر میں داخل ہوئے تو انھیں دیکھ کر میں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ بچّے میرے کرتب دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے میں زور زور سے اچھل کود رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگانے کی کوشش

کی تو برابر والے پنجرے میں جا پڑا، یہ شیر کا پنجرہ تھا۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ شیر سو رہا تھا۔ اچانک دھماکے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خوف ناک آنکھوں سے مجھے گھورا اور اٹھ کر غرّاتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ لوگ شیر اور ریچھ کی لڑائی دیکھنے کے لیے پنجرے کے گرد جمع ہو گئے۔

خوف سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ شیر میری طرف غرّاتا ہوا بڑھ رہا تھا، میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔

"بچاؤ! بچاؤ!"

لوگ مجھے انسانی زبان میں بولتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

شیر میرے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے مجھے خوف ناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے دھاڑنا شروع کر دیا۔

میں نے لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔

"خدا کے لیے مجھے شیر سے بچاؤ، بچاؤ"، میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

شیر غرّاتا ہوا میرے قریب پہنچا اور آہستہ سے کہا۔

"کم بخت اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں نوکری سے نکلوانا چاہتا ہے"۔

یہ کہا اور غرّاتا ہوا واپس چلا گیا۔

پورے چڑیا گھر میں شور مچ گیا۔ یہ ریچھ نہیں ہے۔ اس کی کھال اتار دو"۔

لوگوں نے مجھ پر پتھر پھینکنا شروع کر دیے۔

ایک پتھر میرے سر پر لگا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ شام کو جب مجھے ہوش آیا تو میرا جسم درد کی شدّت سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں سیدھا منیجر کے کمرے میں پہنچا وہ مجھے دیکھتے ہی گالیاں نکالنے لگا،

"کم بخت! تم نے ہماری عزّت خاک میں ملا دی۔ تم نے ہمیں ذلیل کروا دیا۔ نکل جاؤ ورنہ وہ مرمّت کروں گا کہ ساری عمر یاد کرو گے"۔

اور اس نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

# قطب شمالی کا

# سفید ریچھ



(انور مقبول)

تم نے چڑیا گھر میں ایک عجیب و غریب جانور ضرور دیکھا ہوگا، جس کے بدن پر لمبے لمبے سیاہ بال ہوتے ہیں اور جو اپنے بھاری بدن کو بڑی تیزی سے حرکت دے سکتا ہے، اس جانور کو ریچھ کہتے ہیں۔ بندر کی طرح ریچھ بھی دو پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ریچھ کا تماشا دکھانے والے اس کی ناک میں نکیل ڈال کر جس طرح چاہتے ہیں نچاتے ہیں۔ سیاہ ریچھ دنیا کے بہت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے، لیکن ریچھ کی ایک انوکھی قسم تم نے چڑیا گھر میں شاید نہ دیکھی ہو۔ ریچھ کی یہ قسم قطب شمالی کے برفانی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ سیاہ ریچھ سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کے رنگ اور بال برف کی طرح سفید ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسے سفید برفانی ریچھ کہا جاتا ہے۔

سفید ریچھ کبھی کبھار آئس لینڈ اور گرین لینڈ تک بھی آجاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ برف کا کوئی بہت بڑا تودہ ٹوٹ کر پانی میں گرجاتا ہے اور برفانی ریچھ اس کے ساتھ ساتھ تیرتا ہوا ایسے شمالی علاقوں میں آجاتا ہے۔ جہاں عام طور پر یہ کم پایا جاتا ہے۔

سفید ریچھ جب بڑا ہو جاتا ہے تو برفانی علاقوں کے دوسرے جانوروں مثلاً سیل مچھلی وغیرہ کا شکار کرتا ہے۔ ویسے بھی سیل مچھلی سفید ریچھ کی خوراک کا ایک بڑا حصہ ہوتی ہے۔ سفید ریچھ کی لمبائی نو فیٹ اور وزن

سولہ سو پونڈ تک ہوتا ہے۔ قطب شمالی کے باشندے یعنی اسکیمو سفید ریچھ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں اور سمور کے لیے اس کا شکار کرتے ہیں۔ اسکیمو سفید ریچھ کی مدد سے سیل مچھلی کا شکار بھی کرتے ہیں۔ سفید ریچھ ایک خطرناک جانور ہے اور سیل مچھلی کو مارنے میں اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا ہے۔ یہ ریچھ اپنے اگلے پنجے کی صرف ایک ضرب سے سیل مچھلی کو مار ڈالتا ہے۔

سیل مچھلیاں عام طور پر برف کی بہتی ہوئی سلوں کے ساتھ ساتھ تیرتی رہتی ہیں۔ اسکیمو شکاریوں یا سفید ریچھوں سے بچنے کے لیے سیل مچھلیاں جمی ہوئی برف میں سوراخ کرکے چھپ جاتی ہیں، لیکن سفید ریچھ نہ صرف تیرتی ہوئی سیل مچھلیوں کو ہلاک کرسکتا ہے، بلکہ چھپتا چھپاتا دبے پاؤں ایسی جگہ بھی پہنچ جاتا ہے جہاں جمی ہوئی برف میں سیل مچھلیاں چھپی ہوتی ہیں اور بڑی تیزی اور چالاکی سے ان کو پکڑ لیتا ہے۔ بعض اوقات یہ ریچھ جمی ہوئی برف کے سوراخوں کے پاس چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور جب سیل مچھلیاں سانس لینے کی غرض سے سر باہر نکالتی ہیں تو ان پر فوراً جھپٹ پڑتا ہے۔

سیل مچھلی کے علاوہ اس کی غذا میں قطبی گھونس اور برفانی چوہے بھی ہیں۔ کائی والا گھاس اور جھاڑیوں کو بھی یہ اپنے پنجوں سے کھود کر باہر نکال لیتا ہے۔ سفید ریچھ کی مادہ قطب شمالی کے سردی کے موسم یعنی جنوری یا فروری میں بچے دیتی ہے۔

موٹی تہہ والی جمی ہوئی برف میں مادہ ریچھ سوراخ کرتی اور ایک سرنگ سی بنا لیتی ہے، پھر اسی میں دو یا تین بچے دیتی ہے۔ سفید برفانی ریچھ کے بچے بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ تقریباً چھ ماہ تک مادہ ریچھ ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ پھر یہ بچے کافی بڑے ہو جاتے ہیں اور شکار کرکے خود اپنی غذا حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

موسمِ سرما کے دوران سفید ریچھ کے سمور کا رنگ بالکل سفید ہوتا ہے، لیکن جب مختصر مدّت کے لیے موسمِ گرما آتا ہے تو سمور کا رنگ زردی مائل ہوجاتا ہے۔ گردن، سر اور پیٹھ کے مقابلے میں دائیں بائیں کولھوں، پیٹ اور چاروں پیروں کے نیچے کافی گھنا اور لمبا سمور ہوتا ہے۔

برفانی ریچھ تیرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں اور اکثر زمین سے میلوں دور کھلے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ سفید ریچھ انسان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ اکثر و بیشتر اپنی خوراک اور بچی کھچی چیزوں کی تلاش میں وہ برف میں پھنسے ہوئے جہازوں اور انسانوں کے خیموں تک آجاتے ہیں۔ سفید ریچھ میں سونگھنے کی قوّت بہت زیادہ ہوتی ہے اور مری ہوئی وھیل مچھلی یا اپنی غذا کی دوسری چیزوں کو وہ دور ہی سونگھ لیتے ہیں۔

خطرناک اور چالاک ہونے کے باوجود برف جیسے سفید بالوں والے ریچھ اُس وقت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں جب یہ برف کے بڑے بڑے تودوں میں کھیلتے کودتے یا سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔

---

# آواز تین ہزار میل دُور سُنی گئی

۱۸۸۳ء میں ہاراکاٹوا میں ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ اس سے جو شور برپا ہوا وہ ۳ ہزار میل دُور تک سنا گیا۔ ہاراکاٹو سے ایک ہزار میل دُور چین میں یہ شور اتنا شدید تھا کہ فوجی دستے نہ معلوم حملہ آور کو روکنے کے لیے تیار ہوگئے۔ لوگ یہ سمجھے کہ کوئی بہت بڑی فوج شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

# ابو علی کا جوتا

قاضی شفیق الرحمٰن

بہت زمانہ گزرا بغداد میں ابو علی نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ وہ بہت مالدار تھا۔ شہر میں اس کا اچھا مکان تھا۔ کپڑے بھی وہ عمدہ اور اچھے پہنتا تھا، مگر معلوم ہوتا تھا کہ جوتوں کا اس کے پاس ایک ہی جوڑا تھا، اس لیے کہ ان پر رنگ برنگ کے چمڑے کے ٹکڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے جوتوں کے متعلق بعض لوگ کہتے تھے کہ ابو علی نے زندگی بھر ایک ہی جوڑا استعمال کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اس لیے جب اس کا جوتا کہیں سے پھٹ جاتا تو ابو علی موچی کے پاس جاتا اور اس پھٹی ہوئی جگہ نیا پیوند لگوا لیتا۔ اس طرح اس کے سارے جوتے میں رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ ان جوتوں کی وجہ سے سارا بغداد ابو علی کو جانتا تھا، لیکن ابو علی کو ایک بار ان جوتوں کی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دن ابو علی بازار سے گزر رہا تھا، ایک دکان دار نے ابو علی کو دیکھ کر کہا، "جناب میں نے آج ایک دکان میں عطر رکھنے کی بڑی عمدہ شیشیاں دیکھی ہیں۔ ان شیشیوں پر پھول بھی بنے ہوئے ہیں اور ان کی قیمت صرف ساٹھ روپے ہے،



جنھیں آپ جیسے مالدار آسانی سے خرید سکتے ہیں ۔ اگر وہ شیشیاں میری ہوتیں تو میں انھیں ڈیڑھ سو رُپے میں فروخت کرتا۔"

ابو علی نے یہ سنا تو دکان دار سے اس دکان کا پتہ پوچھا اور عطر کی تمام شیشیاں خرید لیں۔ شیشیاں خرید کر وہ ابھی تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ ایک دوسرے دکان دار نے ابو علی کو دیکھ کر کہا، "حضور اس سامنے والے دکان دار کے پاس گلاب کا بڑا عمدہ عطر آیا ہوا ہے۔ وہ عطر اتنا عمدہ ہے کہ آپ نے زندگی بھر ایسا عطر نہیں دیکھا ہوگا۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ اسے بہت سستا فروخت کر رہا ہے۔ آپ فوراً خرید لیجیے۔ اگر وہ عطر میرا ہوتا تو میں اسے دوگنی قیمت پر بیچتا۔"

یوں ابو علی نے وہ عطر پچاس رُپے میں خرید لیا اور بڑے رعب دار انداز میں اس عطر کو ان خوب صورت شیشیوں میں بھر کر گھر پہنچا اور عطر کو شیشیوں کی الماریوں میں رکھ دیا۔ پھر خود خوشی خوشی غسل کرنے حمام کی طرف چلا۔

(بچو! اُس زمانے میں حمام حکومت کی طرف سے شہر کے بیچ میں بنے ہوتے تھے، جہاں امیر و غریب سب کے سب بلا معاوضہ غسل کرتے تھے۔)

حمام کے دروازے پر ابو علی کا دوست عمر ملا۔ عمر نے ابو علی کو سلام کیا، پھر اچانک عمر کی نظریں ابو علی کے جوتوں پر پڑیں۔ عمر نے سر جھکا کر جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "بھئی تم مالدار آدمی ہو ایک جوڑا نیا جوتا کیوں نہیں خرید لیتے؟ تمھاری جیسی خراب جوتیاں تو بغداد میں کسی کے پاس نہیں ہوں گی۔" عمر یہ کہہ کر حمام کی دوسری طرف چلا گیا اور ابو علی غسل کرنے اندر چلا گیا۔ اس نے اپنی جوتیاں باہر ہی رکھ دیں۔

ابو علی جب غسل کر کے باہر نکلا تو اسے دور ایک تپائی کے نیچے رکھی ہوئی اپنی جوتیاں تو نظر نہیں آئیں، بلکہ قریب رکھی ہوئی نئی جوتیوں پر نظر پڑی ۔ ابو علی نے سوچا کہ یہ نئی جوتیاں میرے لیے شاید عمر رکھ گیا ہے۔ وہ نئی جوتیاں پہن کر بڑا خوش ہوا اور اپنے گھر چلا گیا۔

وہ نئی جوتیاں بغداد کے قاضی کی تھیں۔ قاضی بھی حمام میں غسل کرنے آیا تھا۔ جب قاضی غسل کرکے باہر نکلا تو اس نے اپنی جوتیاں تو غائب پائیں اور ان کے بدلے ابو علی کی جوتیاں وہاں رکھی ہوئی دیکھیں۔ قاضی نے وہاں کھڑے ہوئے آدمیوں سے کہا کہ دیکھو ابو علی جیسا آدمی بھی چور نکلا۔ وہ میری جوتیاں چرا کر لے گیا اور اپنی جوتیاں ان کے بدلے میں چھوڑ گیا۔

قاضی نے گھر پہنچ کر نوکر کو بھیجا اور ابو علی کو بلایا۔ ابو علی قاضی کی وہی نئی جوتیاں پہنے ہوئے آیا۔ قاضی نے پوچھا، "ابو علی تم نے میری جوتیاں کیوں چرائیں؟" ابو علی نے کہا، "میں تو یہ سمجھا کہ میرے دوست عمر نے میرے لیے لاکر رکھی ہیں۔"

قاضی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور ابو علی پر چوری کا الزام لگا کر اسے جیل بھیج دیا۔

ابو علی جب قید پوری کرکے جیل سے نکلا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ اب میں اپنے ان جوتوں کو نہر میں پھینک دوں گا، جن کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ جیل جانا پڑا۔ یہ سوچ کر ابو علی نہر پر گیا اور جوتے نہر میں پھینک دیے۔ پانی میں جوتے گرنے کی آواز پر وہ ہنسا اور خوشی خوشی واپس اپنے گھر آ گیا۔

ابو علی کی جوتیاں ایک مچھیرے کے جال میں پھنس گئیں، جو وہاں مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اس نے جوتیاں دیکھ کر فوراً پہچان لیں کہ یہ تو ابو علی کی جوتیاں ہیں اور اپنے دل میں کہنے لگا، "اگر میں نے یہ جوتیاں ابو علی کو پہنچا دیں تو ان کے بدلے وہ مجھے انعام ضرور دے گا۔"

جب مچھیرا ابو علی کے گھر آیا تو وہاں اسے کوئی بھی نہیں ملا۔ ابو علی کے گھر کے دروازے بھی بند تھے، صرف کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ مچھیرے نے یہ خیال کرکے کہ جوتیاں میں کھڑکی کے راستے اندر پھینک دوں اور انعام پھر کسی وقت لے جاؤں گا، جوتیاں کھڑکی میں پھینک دیں۔ اتفاق سے جوتیاں اس الماری پر جا لگیں، جہاں عطر کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں،

جوتیوں کے لگتے ہی الماری کے شیشے ٹوٹ گئے اور عطر کی سب شیشیاں بھی ٹوٹ گئیں اور سارا عطر زمین پر گر گیا۔

جب ابو علی واپس گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی عطر کی سب شیشیاں تو ٹوٹی ہوئی ہیں اور ان کے قریب ہی اس کے رنگ برنگ کے پیوند والے جوتے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر ابو علی رو پڑا اور جوتوں کو برا بھلا کہنے لگا، پھر اس نے قسم کھائی کہ اب جوتوں کو ایسی جگہ پھینکوں گا کہ یہ پھر واپس نہیں آسکیں گے۔

ایک رات کو وہ چپکے چپکے باغ کی طرف چلا اور ایک گھر کی دیوار کے نیچے رک کر دیوار کی جڑ میں گڑھا کھودنے لگا، تاکہ ان جوتوں کو دبا دے، لیکن اسی وقت اتفاق سے اس گھر میں رہنے والوں کی آنکھ کھل گئی اور وہ ابو علی کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے اور قاضی سے کہا کہ یہ رات کے وقت ہمارے مکان میں نقب لگا رہا تھا، تاکہ وہ ہمارا سامان چرالے۔

قاضی نے ابو علی کو دوبارہ چوری کی سزا میں قید کیا اور ایک ہزار رُپے جرمانہ بھی کر دیا۔

پھر جب ابو علی جیل سے رہا ہو کر گھر پہنچا تو سب سے پہلے ان جوتوں سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچنے لگا اور پھر وہ ایک رات کو ان جوتوں کو شہر سے باہر کے ایک تالاب میں پھینک آیا، لیکن دوسرے روز اس تالاب کی صفائی ہوئی اور ابو علی کے جوتوں کو بھی تالاب سے باہر پھینک دیا گیا۔

وہاں سے ایک کتے نے ابو علی کے ایک جوتے کو منھ میں اٹھایا اور ایک باغ کی دیوار پھاند رہا تھا کہ جوتا اس کے منھ سے چھوٹ کر ایک چھوٹے سے لڑکے کے سر پر لگا، وہ لڑکا اس جوتے سے زخمی ہوگیا۔ لڑکے کا والد قاضی کے پاس گیا اور ابو علی کی شکایت کی کہ میرا لڑکا ابو علی کے جوتے سے زخمی ہو گیا ہے۔

قاضی نے حکم دیا کہ ابو علی سے طبیب کا خرچ اور اس سے

دوگنا جرمانہ لیا جائے۔ جب ابو علی نے طبیب کی فیس اور جرمانہ ادا کردیا تو وہ بالکل غریب ہوگیا اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

دوسرے دن قاضی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابو علی آیا اور اس نے اپنا جوتا قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، "اس بار میں اس جوتے کی شکایت لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، اس لیے کہ اس جوتے کی وجہ سے مجھے اتنی تکلیفیں ہوئی ہیں۔ اب آپ اس جوتے کو ہمیشہ کے لیے جیل میں بند کردیجیے اور پھر کبھی باہر مت نکالیے"۔

قاضی سمجھا کہ ابو علی پاگل ہوگیا ہے، مگر جب ابو علی نے شروع سے آخر تک اپنا واقعہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو قاضی کو ابو علی پر رحم آگیا اور اس نے ہنستے ہوئے کہا، "اے ابو علی جاؤ اب تم اس منحوس جوتے کی کبھی شکل نہیں دیکھو گے"۔

قاضی نے ابو علی سے جتنا جرمانہ لیا تھا، وہ سب ابو علی کو واپس کرنے کا بھی حکم دے دیا

(عربی سے ترجمہ)

---

# دنیا کی سب سے چھوٹی چیز کیا ہے؟

اب تک جتنی چیزوں کا پتہ چلا ہے، ان میں سب سے چھوٹے الکٹرون یا وہ اجزا ہیں جن سے مل کر ایٹم بنتے ہیں۔ یہ نظر نہیں آتے، اگر ہم بہت طاقت ور خورد بین سے بہترین قسم کی روشنی میں دیکھیں تو وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز جو ہم دیکھ سکتے ہیں، وہ ایٹم سے پانچ ہزار گنا بڑی ہوگی اور ایک ایٹم الیکٹرون سے اتنا بڑا ہوتا ہے جیسے ایک ذرّے کے مقابلے میں کوئی بڑا گولا۔

## کچھ مچھلیوں میں بجلی ہوتی ہے

جنوبی امریکا کے سمندروں میں ایک قسم کی مچھلی ہوتی ہے، جسے "بجلی کی بام مچھلی" کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کی لمبائی آٹھ فیٹ ہوتی ہے اس میں صرف ½ بدن اور سر ہوتا ہے اور بقیہ حصّے میں بجلی کے خانے اور تیرنے کے پٹھے ہوتے ہیں۔ ان خانوں میں جو بجلی ہوتی ہے، وہ مچھلی اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتی ہے۔ ایک مچھلی ایک وقت میں دو سو بلب روشن کر سکتی ہے۔ نیو یارک میں سچ مچ کے تجربوں میں زندہ مچھلیوں کی بجلی سے لاؤڈ اسپیکر چلانے اور بلب جلانے کا کام لیا گیا ہے۔

## خرگوش کی نسل بڑی تیزی سے بڑھتی ہے

آسٹریلیا میں خرگوش نہیں ہوتے تھے، لیکن ۱۸۵۰ء میں خرگوش کے تین جوڑے آسٹریلیا لائے گئے۔ یہ تین جوڑے آسٹریلیا میں خرگوش کی نسل کے بانی بنے اور ان کی نسل اتنی بڑھی کہ دس سال کے عرصے میں خرگوش آسٹریلیا کے برّ اعظم کے لیے زبردست خطرہ بن گئے۔ انھوں نے فصلیں تباہ کرنی شروع کر دیں۔ حکومت کو خرگوشوں کی اس یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر مارے ہوئے خرگوش پر انعام مقرر کرنا پڑا۔ فصلوں کو خرگوش کے حملے سے بچانے کے لیے ایک ہزار میل طویل باڑ باندھنی پڑی۔ آسٹریلیا کے لوگ خرگوش کے حملے سے پریشان ہو کر دیوانے ہو گئے، لیکن پھر انھیں معلوم ہوا کہ وہ خرگوش کے خطرے کو کار آمد بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے خرگوش کی کھال کے کپڑے بنانے شروع کر دیے اور اس کی برآمد بھی شروع کر دی۔ تجربے کے لیے بحر الکاہل کے ایک ویران جزیرے پر کچھ خرگوش چھوڑ دیے۔ ان کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھی اور آخر اس جزیرے کا تمام سبزہ کھا گئے۔ جب کچھ نہ بچا تو بھوک سے تمام خرگوش ہلاک ہو گئے۔

# کچھ کہو کچھ سُنو

**ندیم اصغر** ۔ واہ کینٹ
س : دنیا کی سب سے لمبی نہر کون سی ہے؟
ج : دنیا کی سب سے لمبی نہر سویز ہے، جس کی لمبائی ۱۰۴ میل ہے۔

**شمسُ الحق** ۔ ڈھاکہ
س : ہیروشیما ؟
ج : جاپان کی ایک بندرگاہ، جس پر دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ایٹم بم گرایا گیا تھا۔

**عتیق الرّحمٰن** ۔ کراچی
س : بھائی جان، آپ کو کون سی مٹھائی زیادہ پسند ہے ؟
ج : جو بھی تم بھیج دو، مٹھائی تو ہر قِسم کی پسند ہے۔

**زیب النّسا** ۔ آزاد کشمیر
س : زندگی میں غم کی حیثیت
ج : یہ ہے کہ خوشی کی قدر آجاتی ہے۔

**سلیم احمد صدّیقی** ۔ کراچی
س : ایک طالبِ علم کی خصوصیات ؟
ج : (۱) تعلیم کا شوق (۲) استاد کا ادب (۳) کتاب کی محبت۔

**خورشید احمد وارثی** ۔ سکھر
س : چاند ستاروں پر سیر و تفریح کا سلسلہ کب شروع ہوگا ؟
ج : بس چاند پر پہنچنے کی دیر ہے۔

**محمّد رمضان الوری** ۔ کراچی
س : کیا علم بھی ایک ہنر ہے ؟
ج : عِلم بہت بڑا ہنر ہے۔

**عبدالمجید فاروقی** ۔ میانوالی
س : کیا ہمدرد نونہال نمونے کے طور پر مفت بھی بھیجا جاتا ہے۔
ج : ہمدرد نونہال کا نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا، جو دوست نمونہ دیکھنا چاہتے ہوں، ان کو اپنا رسالہ

دکھادو، پھر وہ بھی خریدار بن
جائیں گے یا بازار سے ہر مہینے خرید
لیا کریں گے۔

مختار احمد۔ کراچی

س: بھائی جان، اگر میں آپ کو چیلنج
کروں تو؟

ج: ہم نے تمھارا چیلنج سننے سے پہلے
ہی ہار مان لی۔

عبدالحی مدنی — حیدرآباد

س: سال نامہ؟

ج: سال نامہ سال کے سال شائع
ہوتا ہے اور ہمدرد نونہال مہینے
کے مہینے۔

ارشد زمان۔ کراچی

س: بھیّا! تھرمامیٹر کس نے ایجاد کیا؟

ج: پارے والا تھرمامیٹر فارن ہائٹ
نے ۱۷۱۴ء میں ایجاد کیا۔

اکرام الدین۔ مرادآباد (انڈیا)

س: اگر میں نونہال کے لیے کہانیاں
بھیجوں تو آپ شائع کردیں گے؟

ج: نونہال ادیب کے صفحے تمھارے
لیے ہی ہیں۔ کہانیاں ضرور بھیجو۔

خالد پرویز احمد۔ کراچی

س: بھائی جان! دنیا کا سب سے بڑا
عجائب گھر کہاں ہے؟

ج: دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر
"برٹش میوزیم لندن میں ہے۔

عمر دین آرئیں — حیدرآباد

س: بھائی جان آپ کے مزاج کیسے
ہیں؟

ج: تمھاری دُعا ہے۔

سیّد خالد علی۔ لاہور

س: سالانہ خریدار بننے کی کیا شکل ہے؟

ج: آٹھ رُپے بہ ذریعے منی آرڈر ہمیں
بھیج دو۔ سالانہ خریدار بن جاؤ گے۔

مسرت — لالہ موسٰی

س: میری باجی مجھ سے ناراض ہوگئیں۔
بتایئے کِس طرح مناؤں؟

ج: بڑی آسان ترکیب ہے، بس ذرا
حلوائی کی دکان تک ہو آؤ۔

محمّد اقبال۔ میلسی

س: ہیلی کوپٹر کب اور کِس نے
ایجاد کیا؟

ج: سکورسکی نے ۱۹۳۹ء میں۔

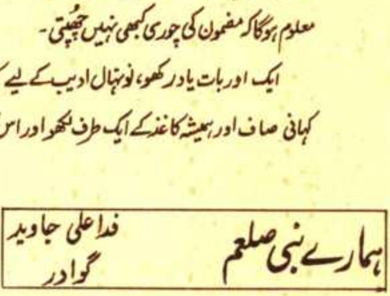
# نونہال ادیب

نونہال ادیب کے صفحات صرف اُن نونہالوں کے لیے ہیں جن کو لکھنے کا شوق ہے اور وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے محنت بھی کرتے ہیں۔ جو نونہال دوسروں کی لکھی یا چھپی ہوئی چیزیں ان صفحات میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں، وہ اچھے نونہالوں کا حق چھین لیتے ہیں۔ ہمیں کئی ایسے خطوط ملے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے نونہال ایک بار چھپی ہوئی چیز دوبارہ چھاپنے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمدرد نونہال پڑھنے والے نونہال ایسی کوئی بات نہیں کریں گے کہ ہمیں دوسرے رسالوں کی طرح ان کا نام شائع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ نونہالوں کو معلوم ہوگا کہ مضمون کی چوری کبھی نہیں چھپتی۔

ایک اور بات یاد رکھو، نونہال ادیب کے لیے کہانیاں، مضامین جتنے مختصر ہوں، اتنا ہی اچھا ہے۔ مضمون، کہانی صاف اور ہمیشہ کاغذ کے ایک طرف لکھو اور اس کاغذ پر کوئی اور چیز نہ لکھو — (ادارہ)

## ہمارے نبی صلعم

فدا علی جاوید
گوادر



جناب حضرت محمدؐ کے اچھے اخلاق کی کوئی مثال نہیں۔ تمام اچھی خوبیاں آپ میں موجود تھیں۔ لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر رنج و مصیبت کو برداشت کیا۔ چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی عزّت کرتے تھے۔ غریبوں کے ساتھ بیٹھتے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ دشمنوں سے کوئی دشمنی اپنے دل میں نہ رکھتے تھے، بلکہ نیکی اور بخشش سے دشمنوں کو درست رکھتے تھے، اور باغیوں کو اپنا فرمانبردار بناتے تھے۔ سادہ اور پاک لباس پہنتے تھے۔ بہت عزّت اور غیرت والے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ سلام میں پیش روی کرتے تھے۔ عقل مندوں اور بوڑھوں کی عزّت کرتے تھے۔ غیبت، جھوٹ بولنا، چغلی کھانا، تکبر کرنے سے بچے رہتے۔ رات خدا کی عبادت میں گزارتے تھے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ

سے یہ چاہتے تھے کہ خدا اچھے کاموں میں مدد کرے اور برے کاموں سے بچاتا رہے۔ آپ اپنے گھر کے اکثر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ امیر و غریب کو ایک نظر سے دیکھتے، غرض آپ کے اچھے اخلاق اور عمل سے متاثر ہو کر لوگ دینِ اسلام کو زیادہ سے زیادہ قبول کرنے لگے اور اسلام بہت جلد دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا۔

## جاگو، جگاؤ

تسلیم الہٰی زلفی
کراچی



اخوت کے جوہر دکھاتے چلو
عداوت کو دل سے مٹاتے چلو

ہر اک فرد کے رنج و غم کو مٹا کر
خوشی کے ترانے سناتے چلو

جو سوئے ہوئے ہیں انھیں تم جگا کر
اخوت کے جوہر بتاتے چلو

بوقت مصیبت تم چٹان بن کر
شجاعت کے گوہر لٹاتے چلو

شمع اخوت کو دل میں جلا کر
نفرت دلوں سے مٹاتے چلو

اٹھو زلفی اب تم بھی پرچم اٹھا کر
غریبوں کو ساتھی بناتے چلو

## درانتی کا بخار

شاہد خلیل نعمانی
کراچی



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص کی درانتی دھوپ میں پڑی رہ گئی اور دھوپ سے تپ کر اس کا لوہا آگ کی طرح گرم ہو گیا۔ اس بے وقوف آدمی نے پہلے کئی مرتبہ سن رکھا تھا کہ جس کو بخار آتا ہے، اس کا جسم گرم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ وہ درانتی کو لے کر ڈاکٹر کو دکھانے چل دیا۔ راستے میں اُسے ایک اور شخص ملا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ بے وقوف آدمی اپنی درانتی ڈاکٹر کے پاس لیے جا رہا ہے تو اسنے کہا، "اگر تم مجھے پانچ رُپے دو تو میں اس درانتی کا بخار اتار دوں"۔ وہ بے وقوف آدمی اس کی باتوں میں آگیا اور

پانچ رُپے دے کر درانتی اس شخص کے حوالے کر دی۔ اس چالاک آدمی نے درانتی میں ایک رسی باندھ کر اسے کنویں میں ڈال دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کنویں میں سے نکالا اور دیکھا کہ درانتی ٹھنڈی ہوگئی تو اس نے بے وقوف سے کہا، "لو تمھاری درانتی کا بخار اتر گیا۔" وہ بے وقوف یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اپنے گھر واپس آگیا۔

کچھ دنوں بعد اس بے وقوف کی بیوی بیمار ہوگئی۔ بے وقوف نے جب اس کے بدن کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کا بدن گرم تھا۔ اسے فوراً اپنی درانتی کے بخار کا علاج یاد آگیا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ "تم بے فکر رہو۔ اس بیماری کا علاج میں خود کر سکتا ہوں، بس ذرا سی ہمّت کرو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کے گلے میں رسی کا پھندا ڈالا۔ بیوی نے شور مچانا شروع کیا، مگر وہ کہاں سننے والا۔ وہ اسے گھسیٹ کر کنویں کے پاس لے گیا اور اسے کنویں میں دھکا دے کر رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زور کے جھٹکے سے بے چاری کا گلا گھٹ گیا اور عورت مر گئی، مگر اس بے وقوف نے اسے کنویں میں ڈال دیا اور تھوڑی دیر کے بعد نکالا تو وہ مر چکی تھی۔ بہت سے یہ تماشا دیکھنے کے لیے کنویں کے آس پاس جمع ہوگئے۔ انھوں نے اس بے وقوف کو بہت برا بھلا کہا اور کہا کہ "تو نے اپنی بے وقوفی سے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔" مگر وہ بے وقوف اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے یہی کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو نہیں مارا۔ میں نے تو اس کا بخار اتارا تھا۔

## اسلامی آداب

محمد صدیق
حیدرآباد



ہر مسلمان کے لیے اسلامی طریقے پر زندگی بسر کرنا ضروری ہے۔ اس لیے تمھیں اسلامی آداب بھی معلوم ہو جانے چاہییں۔

تمھیں چاہیے کہ ہر کام میں اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا مندی کا خیال رکھو۔ ان کی مرضی کے خلاف ہرگز کوئی کام نہ کرو۔ نہ کوئی ایسا کام کرو، جس سے کسی کو تکلیف ہو۔ ایسی باتوں سے بچو، جس سے دوسروں

کی عزّت اور آبرو میں فرق آئے۔ بڑوں کے سامنے گستاخی اور بے ادبی نہ کرو۔ دغا، فریب، غیبت جھوٹ وغیرہ سے بچو۔ جہاں تک ہو دوسروں کا کام کرو۔ اپنا کام دوسروں سے نہ لو۔ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم سمجھو۔ ہر ایک کی عزّت اس کے مرتبہ کے موافق کرو۔ ہر شخص کے ساتھ نرمی اور خوش خلقی سے پیش آؤ۔ ذرا ذراسی باتوں پر مت جھگڑو۔ کسی کی کوئی چیز بغیر اجازت استعمال مت کرو، اگرچہ وہ اپنے عزیز یا رشتہ دار کی ہو۔ دوستوں رشتہ داروں یا کسی دوسرے شخص سے دل لگی کرنا۔ ان کو بے وقوف بنانا، چڑھانا، یا ان کو حقیر سمجھنا بری بات ہے۔ چھپ کر کسی کی بات مت سنو۔ ماں باپ اور استاد کی خدمت اور عزّت کرو۔ ان کو ناخوش نہ ہونے دو۔ ان سے جو کچھ کہو آہستگی اور ادب سے کہو۔ جب ان کے سامنے جاؤ تو پہلے سلام کرو۔ ان کے سامنے ادب سے بیٹھو۔ ان کی طرف پاؤں اور پیٹھ کرکے نہ بیٹھو۔ ان کی باتوں کو دل لگا کر سنو اور یاد رکھو ان کی بات مت کاٹو، بڑوں کا ادب اور ان کی عزّت کرو چھوٹوں سے محبت کا برتاؤ کرو۔ ہر کام سلیقہ سے کرو اور ہمیشہ صفائی کا خیال رکھو۔

## چوہے کے بدلے گدھا

شمیم رفیق
لاہور



افریقہ کے ایک گاؤں میں ایک حبشی لڑکا رہتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ایک موٹا سا چوہا مارا۔ لڑکے نے سوچا اس چوہے کو پکا کر کھایا جائے۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چننے چلا اور جب لکڑیاں چُن کر واپس آیا تو دیکھا چوہا غائب تھا۔ وہ رونے لگا۔ اُس کے باپ نے اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ "بیٹے کیا بات ہے؟" لڑکے نے جواب دیا، "میں نے ایک چوہا مارا تھا، میں اُسے پکا کر کھانا چاہتا تھا، لیکن اب چوہا مجھے نہیں مل رہا۔" یہ کہہ کر وہ اور اونچی آواز سے رونے لگا۔ باپ نے روتے ہوئے لڑکے سے کہا، "میں نے ایک بھدا اور گندہ چوہا دیکھا تھا۔ میں نے اسے پھینک دیا ہے، تم چوہا نہیں کھا سکتے۔ چوہا کھانے کی چیز نہیں۔" لیکن لڑکا یہ سن کر بھی چپ نہ ہوا۔ باپ نے بیٹے کو

چپ کرانے کے لیے ایک سُرخ ٹوپی اُسے دے دی۔ ٹوپی نئی نہیں تھی، پھر بھی لڑکے کو یہ بے حد پسند آئی۔ وہ ہنسا اور ٹوپی کو سر پر ڈال دوسرے گاؤں کی طرف چل دیا۔

اس گاؤں میں اُس نے ایک بوڑھے آدمی کو آگ کے قریب بیٹھے ہوئے پایا۔ لڑکے نے اُس سے پوچھا، "تم کیا کر رہے ہو؟" بوڑھے نے جواب دیا، "میں کلہاڑی بنا رہا ہوں۔" لڑکے نے اپنی ٹوپی اتاری ـــــ اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ دونوں آپس میں کافی دیر باتیں کرتے رہے اور پھر لڑکا بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی ٹوپی غائب تھی۔ وہ رونے لگا۔

بوڑھے آدمی نے لڑکے سے رونے کی وجہ پوچھی۔ لڑکے نے کہا، "میری ٹوپی کھو گئی ہے۔" بوڑھے نے کہا، "میں نے اس ٹوپی کو آگ میں ڈال دیا۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں یہ نہیں جانتا تھا وہ تمھاری ٹوپی ہے۔ میں تمھیں اس ٹوپی کے بدلے ایک نئی اور اچھی کلہاڑی دیتا ہوں۔" یہ ایک پرانی اور ٹوٹی پھوٹی کلہاڑی تھی، پھر بھی لڑکے کو بہت پسند آئی اور وہ کلہاڑی لیے آگے چل دیا۔ اس نے جنگل میں ایک عورت کو دیکھا، جو ایک چھوٹے سے چاقو سے لکڑی کاٹ رہی تھی۔ لڑکے نے اُسے اپنی کلہاڑی دے دی۔ بوڑھی عورت نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ چوں کہ یہ ایک پرانی کلہاڑی تھی۔ لہٰذا جیسے ہی عورت نے کلہاڑی کو درخت کے تنے پر مارا وہ ٹوٹ گئی۔ بوڑھی عورت نے کلہاڑی کے بدلے اُسے کھانا دیا۔ لڑکے نے عورت کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل دیا۔ چلتا چلتا وہ ایک تالاب کے کنارے پہنچا۔ مجھے نہانا چاہیے۔ یہ سوچ کر اُس نے کھانے کو ایک طرف رکھا اور خود پانی میں نہانے لگا۔ ایک بطخ جو پانی کی شفاف سطح پر تیر رہی تھی، تیرتی ہوئی اس کنارے پر پہنچ گئی، جہاں کھانا رکھا تھا۔ کھانے پر نظر پڑتے ہی وہ سارا کا سارا کھانا چٹ کر گئی۔ جب لڑکا نہا کر نکلا تو اُس نے دیکھا کھانا غائب۔ وہ زور سے چلایا، "میرا کھانا کس نے کھایا ہے؟" بطخ بولی، "وہ تو میں نے کھایا ہے۔ میں کھانے کے بدلے تجھے اپنا انڈہ دیتی ہوں۔" لڑکے نے انڈا لے کر بطخ کا شکریہ ادا کیا اور انڈے کو ہاتھ میں پکڑ پانی میں اتر گیا۔ پانی میں انڈا ٹوٹ گیا، جسے ایک مچھلی نے پی لیا۔

اُس نے مچھلی کو پکڑا اور بازار میں بیچ دیا۔ لڑکے نے ان پیسوں سے ایک مرغا اور ایک مرغی خریدی۔ مرغی نے دس چھوٹے چھوٹے چوزے دیے۔ اُس نے ان چوزوں کو بیچا اور ایک بطخ خریدی، پھر بطخ کو بیچا اور ایک بھیڑ خریدلی۔ یہ ایک موٹی بھیڑ تھی۔ لڑکے نے اسے بیچ کر ایک بکری خریدی، پھر اس نے بکری بھی بیچ دی اور ایک گدھا خریدلیا۔ گاؤں کے لوگوں نے گدھے کو بے حد پسند کیا۔ اب وہ اپنا سامان اس پر لادتے اور گدھے کو مارکیٹ کی طرف لے جاتے۔

## طارق ابن زیاد

محمد سلیم اختر
کوئٹہ



طارق بن زیاد مسلمانوں کا وہ بہادر جرنیل تھا، جس نے ہسپانیہ میں اسلام کا جھنڈا گاڑا تھا۔ وہ ایک غریب خاندان میں دمشق میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ جب سولہ برس کا ہوا تو فوج میں بھرتی ہوگیا۔

اس وقت ملک ہسپانیہ پر راڈرک نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا، جو ایک ظالم بادشاہ تھا۔ وہ اکثر اپنے ایک گورنر کاؤنٹ جولین سے لڑتا رہتا تھا۔ جولین میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اکیلا راڈرک کا مقابلہ کرتا۔ اس لیے اس نے شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر سے مدد کی درخواست کی۔ موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ سے اجازت لے کر طارق کو سات ہزار مجاہدوں کی فوج دے کر ہسپانیہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ طارق نے چار جہازوں میں باری باری اپنی تمام فوج ہسپانیہ کے جنوب میں جبرالٹر کے قریب اتاری۔ جو آج کل جبل طارق کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں "طارق کی پہاڑی" ہے۔ فوج اتارنے کے بعد طارق نے چاروں جہازوں کو جلادیا۔ اس پر اس کے سپاہیوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ اگر ہمیں فتح نہ ہوئی تو ہم واپس کیسے جائیں گے۔ طارق نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور اسے ہوا میں لہرا کر کہا،

"تمام خدا کی زمین ہمارا گھر ہے"۔

یہ سن کر سپاہیوں کو غیرت آئی اور انھوں نے بھی اپنی اپنی تلواریں ہوا میں لہرا کر جوش سے کہا، "ہم مسلمان ہیں تمام خدا کی زمین ہمارا گھر ہے۔"

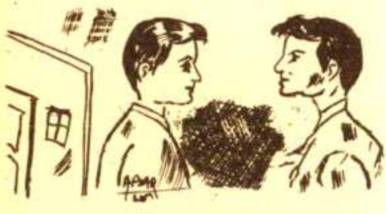
ہسپانیہ کا بادشاہ ایک لاکھ کے قریب فوج لے کر مقابلے کے لیے آیا، لیکن طارق بالکل نہ ڈرا، بلکہ اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو لے کر میدان جنگ میں آگیا۔ دو دن لڑائی ہوتی رہی، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوا، اس پر طارق نے اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ تقریر کی:

"مجاہدو! ہمارے سامنے دشمن ہے، پیچھے سمندر ہے۔ ہم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمیں دشمن کو شکست دینی ہے۔ حوصلہ مت ہارو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی۔ بڑھو دشمن کی ٹڈی دل فوج پر ہلہ بول دو۔"

لڑائی ہوئی۔ ہسپانیہ کا بادشاہ مارا گیا۔ اس کی فوج کو شکست ہوئی اور طارق نے بڑی آسانی سے ہسپانیہ پر قبضہ کر لیا۔ آج کل اسی وجہ سے طارق بن زیاد کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس نے جس ملک کو فتح کیا تھا، اس پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی اور لوگوں کی بھلائی کے لیے بے شمار کام کیے۔

## دوست

سجاد احمد خاں۔ ملتان



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے والد کو ہر وقت اپنے دوست ہی گنواتا رہتا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کے سینکڑوں دوست تھے۔ باپ اسے سمجھاتا کہ دوست وہ ہوتا ہے، جو اپنے ساتھی کی مصیبت میں کام آئے اور اس پر جان تک قربان کر دے، اس لیے دوست ایک یا دو ہی رکھنے چاہئیں۔ اس پر لڑکے نے کہا، "میرا ہر ایک دوست میرے اوپر جان چھڑکتا ہے۔" آہستہ آہستہ لڑکا بڑا ہوگیا۔ اس کے دوست اس کو بے وقوف بناتے رہے، ایک دن اس کے باپ نے کہا کہ "آج ہم تمھارے سب سے گہرے چار دوستوں کو آزماتے ہیں۔ تم خود ہی بتاؤ کہ کن کو آزمائیں؟" لڑکے نے نام بتا دیے۔ چناں چہ رات کے

وقت باپ نے لڑکے کو پھٹے پرانے کپڑے پہنائے ۔ پھر دونوں باپ بیٹے مل کر اس دوست کے گھر چل پڑے ۔ باپ پیچھے رہا اور بیٹے کو آگے بھیجا۔ لڑکے نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے اُس کا دوست نکلا۔ لڑکے نے باپ کے کہنے کے مطابق کہا کہ " مجھے کچھ رُپوں کی ضرورت ہے ابھی دے دو تو بہت اچھا ہے۔ اسی لیے آدھی رات کو آیا ہوں ۔ انشاء اللہ میں تمھارے یہ پیسے ایک ماہ بعد واپس لوٹا دوں گا۔"

دوست نے بہانے بنا دیے ۔ اِس پر لڑکا واپس باپ کے پاس آیا اور دوسرے دوستوں کے پاس بھی گیا، لیکن وہی جواب ملا جو پہلے نے دیا تھا۔ اب باپ نے کہا، " میں اپنے دوست کے گھر جاتا ہوں۔"

دوست کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں نام پکارا۔ کچھ دیر بعد دوست اندر سے اپنے نوکر کے ہمراہ ایک ٹرے میں کھانا، ایک تھیلی پیسوں کی اور ایک تلوار لے کر آیا اور کہا کہ " مجھے دیر ہوگئی میں معافی چاہتا ہوں، کیوں کہ آپ نے گھبرائی ہوئی آواز دی تھی اور آدھی رات کا وقت ہے، اس لیے اگر آپ بھوکے ہیں تو یہ کھانا ہے۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو یہ تھیلی حاضر ہے اور اگر کسی دشمن سے بدلہ لینا ہے تو میں اور میری تلوار حاضر ہے۔

اس پر باپ نے لڑکے سے کہا،

" دیکھا میں نے عمر بھر میں یہی ایک دوست بنایا ہے اور یہی تمھارے سب دوستوں سے زیادہ اچھے ہیں۔" لڑکا شرمندہ ہوا اور آئندہ کے لیے اپنے مکّار دوستوں کو چھوڑ دیا۔

## ڈی - سی

کیو۔ ٹی ۔ شیخ ، ننکانہ صاحب

ڈپٹی کمشنر نے کسی دفتر میں ٹیلی فون کیا۔ جواب ملا، "ہیلو"۔

ڈپٹی کمشنر نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ دوسری طرف سے جواب ملا، "جی میں ہوں ڈی ۔ سی"۔

ڈپٹی کمشنر نے سٹ پٹا کر پوچھا، "ڈی۔ سی تو میں خود ہوں ۔ آپ کون سے ڈی ۔ سی ہیں؟"

دوسرے شخص نے گھبرا کر کہا، اچھا اگر آپ ڈی ۔ سی صاحب ہیں تو پھر مجھے " ڈیوٹی کلرک" سمجھیے ۔

...

## نیک کام

شیخ محمد یٰسین
وار برٹن



سدا رکھ خیال اپنے انجام کا
کر آغاز جب بھی کسی کام کا
برائی کو چھوڑو کرو نیک کام
زمانے میں پیدا کرو نیک نام
اگر تم تکبّر سے پیش آؤ گے
تو سن لو کہ آخر میں پچھتاؤ گے
چلیں گر رسولوں کے رستوں پہ ہم
تو پائیں گے عظمت کو قدموں پہ ہم
نہ بھولو کبھی تم یہ تنہا کی بات
تمھیں سے ہے قوم اور وطن کو ثبات

## تین چیزیں

سید محمود باتور - پشاور



۱۔ تین چیزوں کو حاصل کرو:
علم اخلاق شرافت

۲۔ تین چیزوں پر ایمان رکھو:
توحید رسالت جزا و سزا

۳۔ تین چیزوں کی کوشش کرو:
رزق حلال تربیت اولاد حقوق العباد

۴۔ تین چیزوں کو عزیز رکھو:
ایمان سچائی نیکی

۵۔ تین چیزوں میں اضافہ کرو:
اچھی کتب اچھے دوست اچھے اعمال

۶۔ تین چیزوں پر قابو رکھو:
غصّہ زبان دل

۷۔ تین چیزوں کی تمنا کرو:
تندرستی نیک اولاد اچھی بیوی

۸۔ تین چیزوں سے پرہیز کرو:
جھوٹ غیبت بداخلاقی

۹۔ تین چیزوں کو پسند کرو:
رحم دلی حق گوئی انکساری

۱۰۔ تین چیزوں کے لیے لڑو:
مظلوم ملک حق

۱۱۔ تین چیزوں کا احترام کرو:
والدین استاد قانون

۱۲۔ تین چیزوں سے نفرت کرو:

ظلم بے حیائی غرور

۱۳- تین چیزوں سے کام لو:

عقل ہمت محبت

۱۴- تین چیزوں کو پاک رکھو:

جسم لباس خیالات

۱۵- تین چیزوں سے بچو:

دھوکہ خیانت وعدہ خلافی

۱۶- تین چیزوں کے لیے تیار رہو:

زوال غم موت

## شہر پسنی

محمد اکرم بلوچ - پسنی



شہر پسنی گوادر کے شمال مغرب میں ۹۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مکران کی بہترین بندرگاہ ہے۔ پسنی کے جنوب میں پہاڑ جڈی اور زرین واقع ہیں۔ جڈی میں ماہی گیروں کی کشتیاں بھی کھڑی ہوتی ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ ماہی گیر ہیں۔ یہاں مچھلی بہت پائی جاتی ہے۔

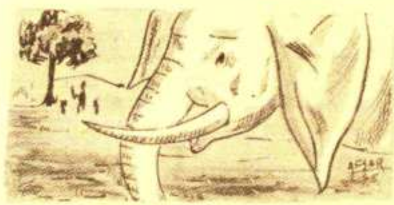
یہاں ٹاؤن کمیٹی، پولس تھانہ اور تحصیل کے علاوہ بہت سے دفاتر ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ مزاج ہیں۔ یہاں کے طالب علم نہایت محنتی ہیں۔ یہاں لڑکوں کا ہائی اسکول ہے۔ اور گرلز پرائمری اسکول بھی موجود ہے۔ ہائی اسکول کے آگے پسنی کا فٹ بال گراؤنڈ ہے۔ پسنی کی فٹ بال ٹیم مکران کی مشہور ٹیم ہے۔ پسنی میں سیر و تفریح کے لیے جنوب مشرق میں مقام شادی کور واقع ہے۔ جہاں مرد عورتیں ہر اتوار اور جمعہ کو پکنک منانے جاتے ہیں۔ پسنی کے کنارے میں مچھلی کا کارخانہ بھی بن رہا ہے، جہاں مچھلی دھو کر دوسرے شہروں تک پہنچائی جاتی ہے۔ پسنی میں مسافروں کے آرام کے لیے مسافرخانہ موجود ہے۔ پسنی کا بس اسٹاپ ½ میل مغرب میں ہے۔ اور ہوائی اڈا ۹ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہر ہفتہ ہوائی جہاز آتا ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت ایمان دار اور نمازی ہیں۔ تفریح کے لیے شادی کور بہت مشہور ہے۔ جہاں پائپ کے ذریعے صاف پانی شہر پسنی تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہاں کوئی (سربراہ) آجاتا ہے تو بڑی گرم جوشی سے اس کا

استقبال کرتے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر باشندے ماہی گیری کرکے گزارا کرتے ہیں۔ مچھلی کی وجہ سے پسنی بہت مشہور ہے۔

پسنی ریگستانی علاقہ ہے۔ ریت کے پیچھے بھی بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ہماری زبان میں اسے (ریک پشتی بلوچ) کہتے ہیں۔ یعنی ریت کے پیچھے رہنے والے۔ یہاں کی زبان بلوچی ہے، جو سارے مکران میں بولی جاتی ہے۔

## ہاتھی کے دانت

محمد مصدق۔ کراچی



پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں ایک شخص عبداللہ رہتا تھا۔ اُس کے پاس دو بونے تھے، جن سے وہ گاؤں میں تماشا دکھاتا اور اپنی روزی کماتا۔ جب اُسے گاؤں میں تماشا دکھاتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تو اُس نے سوچا کہ مجھے کسی شہر میں جانا چاہیئے، جہاں پر میں اپنی روزی اچھی طرح کما سکوں۔

اس گاؤں کے مغرب میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا، مگر وہاں پر پہنچنا بڑا مشکل تھا، کیوں کہ راستے میں دلدل تھی اور دلدل کے بعد ایک گھنا جنگل بھی تھا جس میں ڈاکوؤں کا ایک قبیلہ بسا ہوا تھا، جو اس راستے سے گزرنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دیتے تھے اور اُن کے سامان کو لوٹ لیتے تھے۔

لیکن عبداللہ ان تمام باتوں کے باوجود شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب وہ دلدل کے پاس پہنچا تو عبداللہ کو ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ دلدل کے پار کچھ درخت تھے۔ عبداللہ نے اپنے جھولے میں سے کچھ رسیاں نکالیں اور ان کو جوڑ کر ایک پھندا بنایا اور دلدل کے پار ایک درخت پر پھندا پھینکا، جو درخت کی ایک مضبوط ٹہنی میں جاکر پھنس گیا۔ عبداللہ نے دونوں بونوں سے کہا کہ "تم دونوں اس رسی سے لٹک کر دوسری طرف چلے جاؤ دوسرے کنارے پر پہنچ کر رسّی کو میری طرف پھینک دینا۔" جب دونوں بونے کنارے پر پہنچے تو انھوں نے رسّی عبداللہ کی طرف پھینک دی اور عبداللہ بھی لٹک کر

دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب اُن کے سفر کا ایک مرحلہ پورا ہو چکا تھا۔

سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور عبداللہ کو اس وقت میں جنگل پار کرنا تھا۔ وہ جنگل میں تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگا، کیوں کہ اُسے ڈاکوؤں کا خطرہ تھا۔ آخر کار وہ جنگل کے پار پہنچ گیا۔ وہ ایک بڑے درخت کے پاس پہنچ کر بیٹھ گیا۔ اور وہاں سستانے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ درخت کے اُوپر پڑی۔ اُس نے وہاں پر کوئی سفید چیز چمکتی ہوئی دیکھی۔ عبداللہ درخت کے اُوپر چڑھا درخت کے اُوپر بہت سے "ہاتھی کے دانت" رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک دانت اٹھایا اور نیچے اتر آیا۔ وہ نیچے اُترا ہی تھا کہ اُسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ وہ گھبرا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ گھوڑ سوار اس کے قریب پہنچے اور اُس سے ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا کہ "تم کون ہو؟" عبداللہ نے کہا، "میں ایک مسافر ہوں۔" ایک ڈاکو کی نظر عبداللہ کے ہاتھ پر پڑی۔ اُس نے پوچھا، "تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اور سردار نے اُس کے ہاتھ سے ہاتھی دانت چھین لیا اور اُس سے کہا کہ "تم نے دانت، کہاں سے لیا ہے سچ سچ بتاؤ۔" عبداللہ نے کہا، "میں ایک شرط پر تمھیں بتاؤں گا کہ تم مجھے زندہ چھوڑ دو۔" ڈاکوؤں کے سردار نے کہا، "مجھے منظور ہے۔" پھر اُس نے کہا مشرق کی سمت ایک گاؤں ہے اس سرحد پر بہت سے ہاتھی دانت ہیں۔" ڈاکوؤں کے سردار نے گھوڑا دوڑایا اور اُس کے ساتھیوں نے بھی اپنے سردار کی تقلید کی اور گاؤں کی طرف چلے۔ یہاں تک کہ دلدل آگئی اور انھیں پتہ نہ چلا اور وہ سب کے سب دلدل میں دھنس گئے اور مر گئے۔ اِدھر عبداللہ نے سب دانت لیے اور شہر میں جا کر سب دانت بیچ دیے اور ہنسی خوشی رہنے لگا۔

---

## ہوا میں کیا ہے

ہوا میں ۰۳. فی صد کاربن ڈائی آکسائڈ ۰.۹۳ آرگن، ۲۱ فیصد آکسیجن، ۷۸ فی صد نائٹروجن کے علاوہ چھ مختلف گیسیں تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار اٹھارہ فی صد سے کم ہو جائے تو آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔



# تمھارا خیال ہے

## پہلی بار

ہر دفعہ میں پاکستان میں شائع ہونے والے دیگر رسالے پڑھا کرتا تھا۔ اس بار جب اگست کا میں نے اُن رسالوں کے ساتھ ساتھ ہمدرد نونہال بھی خرید کر پڑھا تو دل کو بڑی خوشی حاصل ہوئی اور افسوس ہوا کہ پہلے سے میں نے اس رسالے کو نظر انداز کیوں کرتا رہا تھا۔ کیا آپ اس کا سال نامہ نہیں شائع کرتے۔ اگر نہیں کرتے ہیں تو میں اپنی ناقص رائے دے رہا ہوں کہ آپ ہمدرد نونہال کا سال نامہ بھی ضرور شائع کریں۔

سب لکھنے والوں کو میری طرف سے مبارک باد دیں۔ اللہ تعالیٰ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔

(عبدالحئی مدنی۔ حیدرآباد)

## ترقی کی طرف

اگست ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں ٹائیٹل بہت ہی لاجواب تھا۔ ہر صفحہ دوسرے صفحے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔

اس ماہ کے رسالے کو دیکھ مجھے بہت خوشی ہوئی، کیوں کہ اب ہمارا رسالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

میرے خیال میں نونہال جیسا رنگین رسالہ پاکستان بھر میں نایاب ہے۔

میری دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

(محمد احسان اللہ بھٹی ۔ ڈیرہ غازی خان)

## انعام

اگست کے "ہمدرد نونہال" کا شمارا نظر سے گزرا، بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہا۔ ٹائیٹل دیکھتے ہی بول اٹھا:

"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر"

آپ نے اس چھوٹے سے رسالے میں بچّوں کے لیے کیا کچھ جمع کر دیا ہے۔ نظم، معیاری کہانی، نصیحت آمیز تخلیقات، دل چسپ معلوماتی مضامین، شستہ مزاح، تاریخی واقعے اور بچّوں کی تربیت کے لیے سب کچھ ہی اس موجود ہے۔ گڑیا کی رخصت، ایوبی اور رہزن مینار، ننھا مصوّر، چمپانزی، چھینکنا بندر کا، قدرت کی دانائی، ایمانداری، اندھیرے اجالے، رس گلّے کے بیج، گم شدہ گھڑی اور آئینہ کا دھوکہ بہت پسند آئے۔ باقی تمام مضامین بھی قابلِ تعریف اور دل چسپ تھے۔ الغرض یہ رسالہ پہلی بار نظر سے گزرتے ہی محبوب رسالے کا درجہ حاصل کر گیا۔

کیا آپ مضامین پر انعام نہیں دیتے؟ ہر مضمون کا کم از کم پانچ رُپے انعام ہونا چاہیے، تاکہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو اور انھیں اپنی محنت کا بدل بھی مل جایا کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ غریب بھائیوں بہنوں کی مدد بھی ہو جایا کرے گی۔ اس تجویز پر غور کیجیے گا۔

(مرزا محمد افضل ۔ راولپنڈی)

## خوب صورت

میں نونہال ہر ماہ پڑھتا ہوں۔ مجھے بہت اچّھا لگتا ہے۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یہ سب رسالوں سے اچھا ہے۔ میں نونہال کو بڑی دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔

اللہ کرے نونہال پہلے سے زیادہ ترقی کرتا جائے۔

(سجاد احمد ۔ کراچی)

## سب کا سرتاج

آپ کا ہمدرد نونہال پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کل جب کہ میں شام کو گھر پر آیا تو ابّا جی نے کہا کہ جاؤ تمھارا ہمدرد نونہال اسٹیشن پر آیا ہوا ہے، اُسے لے آؤ۔ میں بھاگ کر سائیکل اٹھا لایا اور تیزی سے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے نونہال لے کر ایجنسی پر پہنچا تو جلدی جلدی کھولا ٹائیٹل دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ میں ہمدرد کا پچھلے دو سال سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اب ہمارا ہمدرد نونہال

سب رسالوں سے ترقی کر گیا ہے اور ترقی بھی ایسی کہ سب کا سرتاج بنا ہوا ہے۔ اس رسالے میں تو سب کی سب کہانیاں بہت ہی پسند آئیں۔ نونہال ادیب بھی بہت ہی اچھے تھے۔

(عبدالسمیع۔ مظفر گڑھ)

## سب سے اچھا

اگست کا شمارا ملا دل باغ باغ ہوگیا۔ سبحان اللہ کیا سرورق تھا۔ میں نے یہ رسالہ پہلی مرتبہ پڑھا ہے اور مجھے بے حد پسند آیا۔ اس سے اچھا رسالہ اور کبھی نہیں دیکھا۔

(محمد عابد کبیر۔ اسلام آباد)

## دل باغ باغ ہوگیا

ماہِ اگست کا شمارہ ملا اور خوب شوق سے پڑھا۔ ہمدرد نونہال نہ صرف خوب صورتی کی حد تک بڑھا ہوا ہے، بلکہ معیاری مضامین کی وجہ سے کافی جگہ پیدا کرلی ہے۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سچ کہتا ہوں کہ ایسا بہترین رسالہ آج تک نہیں پڑھا۔ چھینکنا بندر کا، بہادر لڑکا، ہنسو اور خوش رہو، عقل مند کی دور بلا، قدرت کی دانائی نونہال ادیب، موتی کی پرکھ، بنی اسرائیل کا چاند وغیرہ۔

میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اس رسالے کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

(عبدالمجید فاروقی۔ میانوالی

## قابل تعریف

اگست کا شمارا ملا۔ سرورق بھی کافی اچھا تھا۔ اس دفعہ کہانیوں میں بہادر لڑکا، عقل مند کی دور بلا، قدرت کی دانائی، پانی کا سفید کنول، ۲۰ ہزار سال کا مزے دار باسی گوشت، چیونٹیوں کے پر اور راز یوسفی کی کہانی "مرغابی کا شکار" بہت اچھی تھیں۔ محشر بدایونی کی نظم "گڑیا کی رخصت" قابل تعریف تھی۔

ہمدرد نونہال جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے، اگر آئندہ بھی اسی رفتار سے ترقی کرتا رہا تو پاکستان میں اتنا مشہور ہوجائے گا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی رسالہ ہوا ہو۔ یہ سب محترم جناب حکیم محمد سعید صاحب کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارا پیارا پیارا رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

(خالدہ پرویز۔ کراچی)

## بچوں کا راہ بر

آج پہلی مرتبہ ہمدرد نونہال دیکھا، پڑھ کر دلی مسرت ہوئی کہ اس زمانے میں

بھی بچّوں کی راہ بری کرنے کا ایک رسالہ موجود ہے۔ رسالہ واقعی ایسا ہے کہ میں نے ہاتھ میں لیا تو اُس وقت تک رکھا، جب تک ختم نہ کر لیا، نئے نئے موضوعات اور اپنی منفرد طرز پر چھپنے والا یہ رسالہ بچّوں کی رہبری کا اعلا نمونہ ہے۔ اس رسالے میں ویسے تو سب ہی اچھے مضامین اور کہانیاں تھیں، لیکن خاص طور پر — سہیل احمد کی "ایک اچھی لڑکا" اور چاند کی منچلی کرن' اور تاریک برّاعظم کے جانور خوب تھے۔

(اسرارالحق صدیقی۔ ٹونک)

## پہیلیاں

ستمبر کا شمارا پڑھا، ٹائٹل بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں بچّوں کے شاعر اقبال، حسن کے دو عظیم شاہکار، ماں کی خوش نودی بہت پسند آئے۔ بھائی جان اگر آپ اشتہاروں کو کم کر کے ایک صفحہ پر لطیفے اور ایک پر پہیلیاں شائع کرنا شروع کر دیں تو ہمارا رسالہ پاکستان کے چوٹی کے رسالوں میں شمار ہونے لگے گا۔

اور ہاں بے احتیاطی حادثات کا باعث بن سکتی ہے، بہت اچھی چیز ہے، ہر ماہ شائع کیا کریں۔ (سجّاد احمد خان۔ ملتان)

## تاریخی مضامین

کافی عرصے سے میں آپ کا یہ رسالہ ہمدرد نونہال باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں، لیکن آج تک آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکا۔

یہ رسالہ خوب صورتی کے لحاظ سے کم نہیں، لیکن ستمبر کا رسالہ مجھے بہت پسند آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ میرے اور ہمارے نونہال دوستوں کی رائے کے مطابق تاریخ و سائنس کے مضامین شائع کریں تو بہت اچھا ہوگا اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کا رسالہ مزید ترقی کرے۔

(حافظ اختر۔ ڈھاکہ)

## لطیفوں کا سلسلہ

میں بہت عرصے سے ہمدرد نونہال کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ پورے پاکستان میں سب سے اچھا رسالہ ہے۔ میری طرف سے عرض ہے کہ آپ سائنسی مضامین اور لطیفوں کا سلسلہ شروع کر دیں۔ آپ ہمدرد نونہال کا سال نامہ ضرور نکالیے۔

میری دُعا ہے کہ میرا رسالہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

(ارشد زماں۔ کراچی)

★

# حلقۂ دوستی

ہمدرد نونہال میں حلقۂ دوستی یعنی آپس میں تعارف، میل جول کا طریقہ جنوری ۱۹۶۴ء سے شروع کیا گیا تھا اور اب تک کم و بیش ایک ہزار نونہالوں کے نام پتے شائع ہو چکے ہیں۔ ہمدرد نونہال کی وسیع اشاعت و مقبولیت کی بنا پر حلقۂ دوستی کے فارم ایک مہینے میں اتنے آجاتے ہیں کہ ہم ان کو کئی ماہ تک شائع نہیں کر سکتے۔ ہم انھیں ترتیب سے رکھتے ہیں اور اسی ترتیب سے شائع کرتے ہیں۔ اس لیے نونہالوں کو کافی انتظار کرنا پڑتا ہے اور بعض نونہال انتظار سے گھبرا کر یا مایوس ہو کر دوبارہ فارم ارسال کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض نونہال جن کا نام پہلے چھپ چکا ہوتا ہے، وہ بھی دوبارہ فارم بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح فارموں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں اس زیادتی کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ حلقۂ دوستی ختم کرنا پڑے۔ ہمیں یقین ہے کہ نونہال ہماری باتوں پر توجہ کریں گے۔ (ادارہ)

اسرار الحق صدیقی ــــــ ٹونک
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا، مطالعہ، مضمون نگاری۔
پتہ: محلہ قافلہ مسجد غول ٹونک راجستھان۔ انڈیا

اعجاز الحق صدیقی ــــــ کراچی
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: مطالعہ، کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: ۴/۳ بی پاک کالونی۔ منگھو پیر روڈ۔ کراچی ۱۶

محمد علی خاں ــــــ حیدرآباد
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: مطالعہ، کرکٹ کھیلنا
پتہ: مکان ۳۳۸۸۔ ۱۵/سی کھائی روڈ جھور امل لین حیدرآباد

محمد سعید اختر ــــــ بارکھان
عمر: ۱۳ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: معرفت چوہدری محمد حسن، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بارکھان

محمد حسن ــــــ فورٹ سنڈیمن
عمر: ۱۶ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: فلم دیکھنا، فٹ بال کھیلنا
پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول ہشتم الف، فورٹ سنڈیمن

جاوید اختر ــــــ کراچی
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا، ریڈیو سننا۔
پتہ: زینت محل ۳۶ ٹاپ فلور دہلی سوداگران کالونی۔ کراچی

صادق علی نسیم ــــــ لائل پور
عمر: ۱۷ سال تعلیم: معمولی
دل چسپیاں: فوٹوگرافی، نونہال پڑھنا، قلمی دوستی
پتہ: کوارٹر ۵/۱۷۵ بلاک ۷ بتلی گھر گیٹ کاٹن ملز۔ لائل پور

زاہد حسین شاہ ــــــ کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: تلاوت کرنا، قلمی دوستی
پتہ: فقیر محمد دُرا خاں روڈ۔ نزد پیر غلام علی شاہ جن شاہ پلاٹ۔ کراچی

شیر بہادر ــــــ لاہور
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، مطالعہ
پتہ: ۱۷ مہابھارت اسٹریٹ ۱۴۳ ریلوے روڈ، لاہور

عبد الماجد نجمی ــــــ احمد پور شرقیہ
عمر: ۱۶ سال تعلیم: ایف۔ اے
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی، کیرم کھیلنا
پتہ: معرفت جے، ایم، خاں صاحب محلہ سرور شاہ۔ احمد پور شرقیہ

رابعہ تسنیم ــــــ کراچی
تعلیم: ۱۴½ سال تعلیم: فرسٹ ایر
دل چسپیاں: مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا، فوٹو
پتہ: ۲۱۷ - پیر الٰہی بخش کالونی نزد جامع مسجد۔ کراچی

منظور عباس عامی ــــ چٹاگانگ
عمر: ۱۸ سال تعلیم: بی، اے
دل چسپیاں: قلمی دوستی، شکار، سیر و تفریح
پتہ: حمزہ باغ کالونی پوسٹ اے، جے، ایم۔ چٹاگانگ

زین العابدین مصطفیٰ قادری ۔ کراچی
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، اخباروں میں سوال جواب کرنا
پتہ: ۹۵۲۔کلاتھ مارکیٹ اسٹریٹ، کاغذی بازار، کراچی

سیف اللہ خاں اجمل ــــ گوجرانوالہ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا، عبادت کرنا
پتہ: پبلک ہائی اسکول جلال پور بھٹیاں ۔ضلع گوجرانوالہ

محمد ریاض رضوی ــــ ہزارہ
عمر: ۱۶ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔
پتہ: شوکت میڈیکل ہال مانسہرہ ۔ضلع ہزارہ

نجمہ جعفری ــــ کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: مطالعہ، قلمی دوستی
پتہ ۳/۱۲۹۳ ڈرگ کالونی کراچی نمبر ۲۷

اشرف کیانی ــــ ایبٹ آباد
عمر: ۹ سال تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، قلمی دوستی
پتہ: معرفت میجر گل بہار کیانی ۔ بلوچ سنٹر۔ ایبٹ آباد

صلاح الدین ایوبی ــــ گوجرہ
عمر: ۱۷ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: نماز، رسالے، ناول پڑھنا
پتہ: صدیق منزل سلطان پورہ کالونی، گوجرہ

حامد حسین ــــ کراچی
عمر: ۹ سال تعلیم: سوم
دل چسپیاں: رسالے پڑھنا، کھیلنا۔
پتہ: صغرا منزل، ۲۸۴ پرنسٹن ٹانک واڑہ ۔کراچی

جاوید اختر ــــ نواب شاہ
عمر: ۱۸ سال تعلیم: فرسٹ ایئر
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: معرفت لین میڈیکل اسٹور مارکیٹ روڈ۔ نواب شاہ

بے بی۔ بلقیس بیگم ــــ ڈھاکہ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، نماز پڑھنا
پتہ: ایس۔پی کوارٹر ۱۱ پوسٹ آفس لائن ۔آدم جی نگر۔ ڈھاکہ

محمد فیاض ــــ کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا، رسالے پڑھنا
پتہ: ای/۸۲۳ کورنگی ۔ کراچی ۳۱

محمد یوسف قریشی ــــ راولپنڈی
عمر: ۱۳ سال۔ تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا
پتہ: مسلم ہائی اسکول ۱ سید پوری روڈ۔ راولپنڈی

ایس۔ اے رشید اقبال ــــ کراچی
عمر: ۱۹ سال تعلیم: انٹر
دل چسپیاں: مطالعہ، قلمی دوستی، کرکٹ،
پتہ: بی ون ۳/۱۰ لیاقت آباد۔ کراچی۔

اعجاز علی ــــ ملتان
عمر: ۱۰ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، فٹ بال کھیلنا
پتہ: معرفت امتیاز برادرز ٹائر والے التمش روڈ۔ ملتان

رقیہ شبانہ انجم ــــ کھلنا
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، نونہال پڑھنا۔
پتہ: معرفت ایم اے ہادی، ہاؤسنگ اسٹیٹ، بلاک ۲۶ ٹی۔ پوسٹ مزگنو کھلنا

محمد صفدر ــــ کانجن
عمر: ۱۰ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: فوٹو جمع کرنا، نونہال پڑھنا
پتہ: بدر منیر کیمیکل ورکس منڈی ماموں ۔کانجن

زبیر احمد قریشی ——— ملتان
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا۔ ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: برادرز میڈیکل سروس نشاط روڈ حرم گیٹ ملتان شہر

جے۔ رحمٰن ——— کراچی
عمر: ۱۷ سال تعلیم: سیکنڈ ایئر
دل چسپیاں: قلمی دوستی، مطالعہ۔ ٹینس کھیلنا
پتہ: ۱۰۴ پی۔ آئی۔ بی۔ کالونی۔ کراچی

شمیم احمد ——— میمن سنگھ
عمر: ۱۳ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ مطالعہ۔ ہاکی، فٹ بال
پتہ: رول نمبر ۱ قائد ملت ہائی اسکول۔ میمن سنگھ

اقبال احمد ——— کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ کرکٹ کھیلنا
پتہ: عائشہ باوانی اکیڈمی۔ ۱۸۵ بزرٹا لائنز۔ کراچی

غیاث الدین خاں ——— حیدرآباد
عمر: ۱۲ سال تعلیم پنجم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، قلمی دوستی
پتہ: ڈاک خانہ ٹنڈو قیصر ضلع حیدرآباد

محمد صغیر ——— کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، نونہال پڑھنا۔
پتہ: آزاد منزل فلیٹ نمبر ۹ رنچھوڑ لائن کراچی

محمد کمال خاں ——— سوات
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، نونہال پڑھنا
پتہ: معرفت حکیم محمد شاہ جہاں بازار مینگورہ (حاجی باباچوک) سوات

محمد ہاشم ——— میرپور خاص
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، کرکٹ
پتہ: نہم سی، گورنمنٹ ہائی اسکول میرپور خاص

محسن الٰہی ——— راولپنڈی
عمر: ۸ سال تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: بڑوں کو سلام، چھوٹوں کو پیار کرنا
پتہ: مکان نمبر ۳ گلی نمبر ۲ ڈھوک دتہ امرال۔ راولپنڈی

ذکاءاللہ انجم ——— ڈیرہ غازی خاں
عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ مزاحیہ لکھنا
پتہ: دہم سی گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ شریف (ڈی جی خاں)

محمد یونس عاصم ——— ملتان
عمر: ۱۲ سال تعلیم: آٹھویں
دل چسپیاں: رسائل پڑھنا
پتہ: پرنس ہوٹل بیرون حرم گیٹ نشاط روڈ ملتان

فرحت انور ——— چٹا گانگ
عمر: ۱۰ سال تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا
پتہ: ایس عبدالحمید محمد انور اینڈ کمپنی ایر مارکیٹ۔ چٹا گانگ

اختر ——— ڈھاکہ
عمر: ۱۵ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، لکھنا پڑھنا
پتہ: ۳/۲۵ ڈیسنٹ لڑی روڈ ڈھاکہ نمبر ۱

ایم کلیم ——— ڈھاکہ
عمر: ۱۸ سال تعلیم: انٹر
دل چسپیاں: ٹکٹ، تصویر جمع کرنا، ناول پڑھنا
پتہ: ۵۸ سوبل داس روڈ چوہدری بازار، لال باغ ڈھاکہ

سید مقصود علی ——— کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: ۲/۵، ۷۷، ڈرگ کالونی کراچی

دلشاد شہزاد ——— مارواڑ
عمر: ۱۲ سال تعلیم: اردو، ہندی، عربی
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: ناگو مارواڑ، راجستھان۔ انڈیا

**نصر اللہ خاں قمر —— ڈیرہ غازی خاں**
عمر: ۱۵ سال — تعلیم: نہم
دل چسپیاں: کار چلانا اور تصویریں جمع کرنا
پتہ: معرفت ممتاز میڈیکل اسٹور محمد پور، ضلع ڈیرہ غازی خاں

**محمد سلیم —— شیخوپورہ**
عمر: ۱۱ سال — تعلیم: ششم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا، فروٹ کھانا
پتہ: معرفت ہمدرد کتب خانہ ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ

**محمد ارشد —— خیرپور**
عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ششم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، نونہال پڑھنا
پتہ: ٹالپر وڈا - ڈاک خانہ خاص براستہ سیٹھارجا خیرپور

**عبدالرشید ثاقب —— رحیم یار خاں**
عمر: ۱۶ سال — تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: سپروائیزر ڈیری فارم لیور برادرز لیمیٹڈ رحیم یار خاں

**محمد زبیر احمد پراچہ —— کراچی**
عمر: ۱۴ سال — تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: عائشہ باوانی بوائز اکیڈمی ۱۰۵ ابرنٹ لائن - کراچی

**اصغری خیالی —— حیدر آباد**
عمر: ۱۵ سال — تعلیم: ایف وائی، سائنس
دل چسپیاں: مطالعہ - قلمی دوستی
پتہ: ۳۸۳ لطیف آباد نمبر ۶ - حیدر آباد

**سید طاہر السلام —— ٹونک**
عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، مطالعہ
پتہ: معرفت شفا منزل برکات روڈ ٹونک (انڈیا)

**محمد طارق شہزاد —— ملتان**
عمر: ۱۱ سال — تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا
پتہ: انٹرنیشنل ریڈیو کمپنی بالمقابل پیلس سینما حسین آگاہی ملتان

**اقبال حشمت —— کراچی**
عمر: ۱۲ سال — تعلیم: چہارم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، کرکٹ کھیلنا
پتہ: ۱۱/۱۴ بی ایریا - لیاقت آباد، کراچی

**ایس ایم ضامن رضوی - کراچی**
عمر: ½۱۵ سال — تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، مطالعہ
پتہ: ۳۹ الف کاظم منزل رضویہ ہاؤسنگ سوسائٹی ناظم آباد کراچی

## فارم حلقۂ دوستی

نام: . . . . . . . . . . . . . . . .
عمر: . . . . . . . . . . . . . . . .
تعلیم: . . . . . . . . . . . . . . . .
دل چسپیاں: . . . . . . . . . . . . . . . .
پتہ: . . . . . . . . . . . . . . . .
. . . . . . . . . . . . . . . .

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے زین پیکیجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا۔



اکتوبر ۱۹۶۵ء
رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

دسواں شمارہ
بارھویں جلد

# ہمدرد نونہال

## اس رسالے میں کیا ہے؟



قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے ——— سالانہ آٹھ رُپے

PRINTED AT ZAIN PACKAGING INDUSTRIES LTD. KARACHI